لہ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

جلد : ۴
شمارہ : ۸

صفر المظفر ۱۳۸۹ھ
مئی ۱۹۶۹ء

اس شمارے میں

بدل اشتراک :- مغربی پاکستان سالانہ چھ روپے فی پرچہ ۵۰ پیسے - مشرقی پاکستان : سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے فی پرچہ ۶۵ پیسے
غیر ممالک : سالانہ ایک پونڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

راقم الحروف ۲۷ ذی الحجہ کو حجازِ مقدس روانہ ہوا تو تبدیلیٔ اقتدار کی تحریک زوروں پر تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے شعلوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ طرح طرح کی خبروں نے تمام مسلمانوں بالخصوص پاکستان کے حجاج کو نہایت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور اس تصور سے دل دھڑکنے لگتا کہ جو ملک لاثانی قربانیوں کے صدقے اسلام کا بول بالا کرنے کے نام پر حاصل کیا گیا آج وہ ملک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس عالم میں سب زائرین بیت الحرام کے ہاتھ بے اختیار رب البیت کی بارگاہ میں اٹھنے لگتے۔ مواجہۃ الرسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں آہ و زاری ہونے لگتی۔ ملتزم اور غلافِ کعبہ سے لپٹ لپٹ کر ہر ایک زبانِ حال سے طلبگار تھا کہ یا اللہ برِصغیر میں مسلمانوں کے اس حصار کو جو انکی نا اہلیوں کی بدولت آج تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، ایک بار اور موقع دے شاید انہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس اور غلطیوں کی تلافی کا شعور پیدا ہو جائے اور وہ نئے سرے سے اپنے رب کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو استوار کر سکیں اسی اضطراب میں مارچ کے آخر میں یکایک صدر ایوب کے زوال اور فوجی انقلاب کی خبر آئی اور ظاہر ہے کہ ایک مطلق العنان اور خود سر حکمران کا اس انداز میں زوال و سقوط اپنے پہلو میں عبرت و موعظت کے صدہا دفتر بھی لیکر آیا۔ عاد و ثمود جیسی اقوام اور جابر و قہار حکمران کے عروج و زوال کی صدہا داستانیں پہلی و عبرت عبرت دے رہی ہیں، مگر یہ تازہ اور چشم دید مثال تو اس بے لاگ حقیقت کی کھلی کھلی شہادت دے رہی ہے کہ "اے احکم الحاکمین تو ہی مالک الملک ہے، جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

انقلاب آیا اور ہمارے لئے ایک بہت بڑا سبق بن کر آیا کہ جب تک ہم اپنے انتشار اور مصیبتوں کا سرچشمہ کسی اقتدار کو سمجھتے رہے، خداوند کریم سے پلک جھپکتے میں اس کا بوجھ تمہاری گردنوں سے اتار دیا تاکہ تم پر اتمامِ حجت ہو جائے۔ پس جس کا تسلط تمہارے اعمال کی شامت تھی اس سے گلو خلاصی بھی تمہارے لئے ایک کڑی آزمائش ثابت ہوئی، ایک ایسی آزمائش جس نے ہمارے اخلاق و کردار اور اجتماعی زندگی کے بچے ہوئے بہت سے امتیازات و عیوب، باطنی نظریات

اور قوم و ملک کے ساتھ وفاداری یا غداری کا ایک آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس آئینہ میں ہماری تصویر کتنی ڈراؤنی ہے؟ ہم نے ایک دوسرے کی عزت و آبرو پر ہاتھ صاف کیا، ہم نے انسانوں کو زندہ جلایا، ان کا گلا گھونٹا اور خون پسینے سے کمائی ہوئی دولتوں پر عدل و انصاف کے نام سے غارتگری کا بازار گرم کیا، ملک کا وجود ہی گرداب سیاست میں ہچکولے کھا رہا تھا مگر ہم نے اس وقت بھی ڈیڑھ اینٹ کے جماعتی اغراض اور مفادات میں لچک پیدا نہ کی، یہ سب چیزیں ہمارے اعمال و کردار اور ہمارے روبہ تنزل معاشرہ کا بھیانک منظر پیش کر رہی ہیں، اور یہ ٹھیک ردعمل تھا ان غلط کوششوں کا جنہیں ہم اپنے معاشرہ کا شعار بنانے لگ گئے تھے، وہ معاشرہ جو خوف خدا اور تصور آخرت سے غافل ہو چکا ہو، ذاتی اغراض اور مفادات سے الگ ہو کر کسی معاملہ پر ہرگز غور نہیں کر سکتا۔ وہ نظام تعلیم جس کا مبلغ علم چند روزہ زندگی کی خوش عیشی رہ گئی ہو، اسلامی تعلیم اور پیغمبرانہ اخلاق و اعمال کی جھلک بھی اس میں نہ ہو ہرگز قوم و ملت کو ایسے کل پرزے نہیں دے سکتا، جو ملک و ملت کو حقیقی ترقی اور کامیابی سے ہمکنار کر دے۔ ایسے افراد خواہ ان کا تعلق حکام سے ہو یا رعایا سے، رائے دہندہ ہوں یا سیاستدان، انتظامیہ ہو یا عسکری قوت ہرگز ملک کو کوئی ایسا معتدل اور متوازن نظام نہیں دے سکتے جس میں معاش کے ساتھ معاد اور ذاتی مفاد کے ساتھ پورے معاشرہ کے اخلاق اور معاشی حقوق کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو۔

ہماری بربادی اور تباہ حالی کی یہ داستان طویل ہے۔ اپنی ذلت و ادبار کی ماتم سرائی کب تک کی جائے۔ عرض مدعا یہ ہے کہ ۲۵ مارچ کا یہ انقلاب ہماری زندگی کا ایک نیا موڑ ہے جو ہمیں زبان حال سے دعوت دے رہا ہے کہ: اپنے رب سے اسلام کے نام پر کئے ہوئے عہد و میثاق کا ۲۲ سال تک مذاق اڑانے والو! یہ محض خدا کی بے حد و حساب رحمت ہے کہ اتنی ستم کاریوں کے باوجود بھی تمہارا وجود قائم رہا، ورنہ تم تو اپنے ہاتھوں سے اس ملک و ملت کا شیرازہ بکھیرنے لگے تھے مگر یہ تو صرف اسکی دستگیری ہے کہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے کہ شاید تم سنبھل جاؤ۔ بلاشبہ ۲۵ مارچ کا دن ہمارے لئے ایک رحمت سے کم نہیں مگر کیا یہ امن سکون اور اطمینان تمہاری پریشانی اور بربادی کا خاتمۃ الباب ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو محاسبۂ اعمال کا ایک وقفہ ہے، تاکہ تم سدھر سکو اور اپنے جذبات اور میلانات کا رخ معاشی جنتوں سے زیادہ دائمی اور حقیقی جنت کی طرف پھیرنے لگ جاؤ، حالات اور قرائن تمہیں پکار پکار کر جھنجھوڑ رہے ہیں کہ اگر تمہیں اس ملک میں چین اور سکون سے رہنا ہے، تمہیں دنیا کے ساتھ دین کی بھلائی اور فرد و معاشرہ کی اصلاح مطلوب ہے تو امن و عافیت کی اس فرصت کو غنیمت جان لو، اپنے نظریاتی سرحدات کو

از سرِ نو مضبوط اور درست کر لو، قوم کی ذہنی تربیت اور اخلاقی حالت پر اپنے مساعی مرکوز کر دو، تاکہ انہیں کھرے اور کھوٹے کی تمیز اور حق و باطل کا امتیاز ہوتے گے۔ اگر تمہاری غفلت کیشی کا یہی عالم رہا تو جب بھی اس عارضی نشے کا سکون اتر گیا تو تمہاری زندگی کی ناؤ کو قیامت بر قیامت اور ہولناک طوفانوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر تمہیں اسلام اللہ اسلامی اقدار عزیز ہیں، طبقاتی نا ہمواریوں سے نجات مطلوب ہے، خوشحال اور متوازن زندگی اور پاکیزہ نظام حیات محبوب ہے۔ تو اے دانشورو، اے علماء کرام، اور اے سیاستدانو! اب تو اپنی اور قوم کی بگڑی پر رحم کرو، ان کی مشکلات اور پریشانیوں کا صحیح حل ان کے سامنے پیش کر دو۔ قوم کے ماؤف ذہنوں کا رخ لندن اور نیویارک کی بجائے مکہ مکرمہ کیطرف پھیر دو۔ ان کے بے چین دلوں میں پکنگ اور ماسکو کی بجائے مدینہ طیبہ کی محبت جاگزین کر دو، اگر تم نے ان کے ہاتھوں میں قرآن و سنت تھما دیا تو ماؤزے تنگ کی سرخ کتاب اور کارل مارکس کی کیپٹیل خود بخود ان سے چھوٹ جائے گی، اگر یہ اسلام کی جنت آفریں زندگی کی جھلکیاں دیکھنے لگیں تو یورپ کی نظر فریب تہذیب پر لعنت بھیجنے لگیں گے۔ یہی سبق ہے حالیہ حالات اور تازہ انقلاب کا، وقت کا تقاضا ہے کہ اگر ہمیں اپنی اور اس ضمن میں اس ملک کی بقاء منظور ہے تو آئیے نئے سرے سے اسلام کی طرف لوٹیں، وہ اسلام جو ہماری مصیبتوں کا مداوا اور ہماری دائمی مسرت اور فلاح کا پیغام ہے اگر ہم نے اس فرصت کو بھی نذر غفلت کر دیا اور اپنے حالات درست نہ کئے تو خدانخواستہ مستقبل میں میں کفر و الحاد اور دہشت و بربریت کی تازہ دم یلغار ہمارا نام بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دے گی۔

ان اللہ لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

۲ مئی - ۱۵ ار مئو

مہاجر مدینہ حضرت الشیخ مولانا عبدالغفور صاحب العباسی جو اس وقت مدینہ طیبہ میں سلسلۂ نقشبندیہ ممتاز مرشد اور آسمان رشد و ہدایت کا درخشندہ ستارہ ہیں۔ بلدۃ الرسول علیہ السلام میں ان کا وجود باجود پاکستان کے لئے خاص طور پر رحمت خداوندی ہے، حج کے موقعہ پر آپکی حالت بہت بگڑی، بعد میں افاقہ ہوا ۲۳ اپریل کو کراچی بغرض علاج تشریف لائے مگر آخری اطلاع کے مطابق مرض بڑھ جانے کی وجہ سے پرسوں مدینہ طیبہ واپس ہوئے۔ تمام حضرات سے دعا کی درخواست ہے۔ (سمیع الحق)

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ
شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ ۔ دہلی

محمد ﷺ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بحیثیت
داعی الی اللہ

مقاصد ــــ خصوصیات ــــ آداب ــــ مراتبِ دعوت

پروپیگنڈے کے غیر معمولی تاثر سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یورپ کے اس پروپیگنڈے نے کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے ہوئی ہے۔ دماغوں کو یہاں تک متاثر کیا ہے کہ خود مسلمان بھی آداب دعوت و تبلیغ فراموش کر بیٹھے، تقریباً ایک صدی پوری گذر گئی کہ علمائے اسلام کے ذہن اور دماغ اس غلط پروپیگنڈے کی تردید میں مصروف رہے۔ "لا اکراہ فی الدین" کو بار بار دہرایا گیا۔ اور اسکی تشریح و تفسیر میں تمام قلمی اور فکری طاقتیں صرف ہوتی رہیں، حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی گئی تو اس میں بھی یہی تردیدی رنگ غالب رہا مگر قرآن حکیم نے دعوت اسلام کے جو طریقے بتائے ہیں، اور داعیان اسلام کے جو فرائض بیان فرمائے ہیں وہ ایک اہم اور ضروری موضوع کی حیثیت سے سامنے نہیں آسکے۔ اس مقالہ میں یہی آداب و فرائض اختصار کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں ؎ عمرے ست کہ آوازۂ منصور کہن شد — من باز بہم قصۂ دار و رسن را

محمد میاں

یاایھا النبی انا ارسلناک شاھدا و مبشرا و نذیرا وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا وبشر المومنین بان لھم من اللہ فضلا کبیرا ولا تطع الکافرین والمنافقین ودع اذاھم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا۔ (سورہ احزاب ع ۶ ۔ ۲۲ ع ۲)

دوسروں کو ہم خیال اور ہم نوا بنانے کے سلسلہ میں چند الفاظ مستعمل ہوتے ہیں، ان کے معنی

سمجھے اور مطلب ملاحظہ فرمائیے۔
۱۔ دعوت — بلانا، پکارنا، کسی کام پر آمادہ کرنا۔ ۲۔ داعی — بلانے والا، پکارنے والا، کسی کو کسی بات پر آمادہ کرنا۔ ۳۔ تبشیر — بشارت دینا، خوشخبری سنانا۔ ایسی خبر دینا جس کا اثر فوری طور پر سننے والے کے چہرے بشرے پر نمایاں ہو جائے۔ ۴۔ مبشر۔ ۵۔ بشیر۔ بشارت دینے والا۔ ۶۔ انذار — آگاہ کر دینا، خبردار کر دینا، ——— خطرہ کی خبر دینا۔ خطرناک بات کے خطرہ سے خبردار کر دینا۔ ۷۔ منذر، ۸۔ نذیر۔ آگاہ کر دینے والا، خبردار کر دینے والا، ایسی بات کی خبر دینے والا جسمیں کوئی خطرہ ہو۔ ۹۔ تبلیغ۔ ۱۰۔ ابلاغ۔ پہنچانا۔ ۱۱۔ مبلغ۔ پہنچانے والا۔

لیکن اسلام ان الفاظ کو خاص خاص ذمہ داریوں کا عنوان اور خطاب قرار دیتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ جب بھی یہ الفاظ استعمال کئے جائیں تو استعمال سے پہلے ان ذمہ داریوں کا احساس ضروری ہے، ورنہ یہ استعمال چرب زبانی، اور ایک طرح کا شاعرانہ تخیل ہوگا جو بارگاہ رب العزت میں سب سے زیادہ مبغوض اور مردود ہے۔ لم تقولون مالا تفعلون۔ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔ (کیوں کہتے ہو ایسی بات جو کرتے نہیں ہو، یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی زیادہ مبغوض اور قابلِ نفرت ہے کہ وہ بات کہو جو کرو نہیں)

شعرا کو آوارہ گردوں کا قافلہ اسی لئے کہا گیا کہ: یقولون مالا یفعلون۔ (وہ کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے) نیز ارشاد ہے:

لاتحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنھم بمفازۃ من العذاب ولھم عذاب الیم۔ (آل عمران رکوع ۱۹)

"جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں کیلئے سراہے جائیں جو انہوں نے کبھی نہیں کئے۔ (عمل صحیح اور عمل صالح سے محروم ہوں اور مولانا کہلائیں، درد ملت سے ناآشنا اور قائد ملت کہلائیں) تم ہرگز ایسا نہ سمجھنا کہ وہ (آفت واسطے) عذاب سے بچے رہیں گے۔ نہیں۔ یقیناً ان کے لئے (رسوا کرنے والا) دردناک عذاب ہے۔"

ترجمہ آیات | "اے نبی ہم نے تم کو بھیجا بتانے والا اور خوشی سنانے والا اور ڈر (سنانے والا

سلہ ان تمام ذمہ داریوں کی تفصیل و تشریح بہت طویل ہے۔ مگر اس مختصر مضمون میں صرف اشارات کی گنجائش ہے جو آئندہ صفحات میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چراغ چمکتا اور خوشی سنا (خوشخبری دے) ایمان والوں کو کہ ان کو ہے خدا کیطرف سے بڑی بزرگی (فضیلت) اور کہا نہ مان منکروں کا اور دغا بازوں کا اور چھوڑ دے ان کو ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ بس ہے کام بنانے والا" (موضح القرآن)
آیت کا اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ عبد القادر دہلویؒ کے الفاظ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ انہیں الفاظ کے دامنوں میں آداب و مقاصد تبلیغ کے جو قیمتی جواہر پارے چھپے ہوئے ہیں اب ان کی طرف توجہ فرمائیے۔

آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں فرائض یا طریقہ کار بتانا آیت کا مقصد نہیں ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ بیان مقاصد کے لئے جو الفاظ لائے گئے ہیں ان سے فرائض، طریق کار اور مبلغ کی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

شاہداً سب سے پہلا لفظ شاہد ہے۔ شاہد "شہادت دینے والا" شہادت کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے، جو بات خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو یا اپنے کانوں سے سنی ہو۔ اسکی شہادت دی جاسکتی ہے۔ ایسی بات بلا کسی جھجک کے ڈنکے کی چوٹ پورے بھروسہ اور یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور دوسروں کو بھی اس کے مان لینے اور تسلیم کر لینے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی بناء پر شاہد کا فرض ہے کہ اگر اس کے دل میں کھوٹ نہیں ہے تو وہ اپنے مشاہدہ کو یقین اور بھروسہ کی پوری قوت کے ساتھ بیان کرے ورنہ وہ شہادت کا حق پورا ادا نہیں کرے گا۔

نبی اور فلسفی کا فرق نبی اور فلسفی میں یہی فرق ہوتا ہے کہ نبی جو کچھ کہتا ہے وہ یقین اور اذعان کی پوری قوت کے ساتھ کہتا ہے اس میں کوئی تردد، کوئی شک و شبہ، کوئی وہم یا احتمال اسکو نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس یقین کی بنیاد پر کہتا ہے، جو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں کسی ایسے ذریعہ سے پیدا کر دیتا ہے جو مشاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکو اور صرف اسی کو "حق" سمجھتا ہے اور اس بناء پر وہ اس "حق" کے لئے ہر قربانی پیش کرنے اور ہر ایک مصیبت جھیلنے کیلئے تیار رہتا ہے، ایک شخص جو کسی بلندی پر کھڑا ہوا آفتاب کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے، دنیا بھر کے اندھے بہرے یا وہ لوگ جو اس بلندی سے نیچے ہیں جو آفتاب کو نہیں دیکھ رہے ہیں یہ سب اپنی فوج بنا کر اس کو مجبور کرنا چاہیں کہ وہ "قرص آفتاب" کے مشاہدہ سے انکار کر دے تو اگر وہ بزدلی کا مریض نہیں ہے تو وہ اس پوری فوج کے ہر ایک مواخذہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار

ہو جائیگا۔ اور اس کے لئے تیار نہ ہوگا کہ خود اپنی زبان سے اپنی آنکھوں کو جھٹلائے فلسفی یا محقق کے پاس مشاہدہ نہیں ہوتا۔ نہ مشاہدہ جیسی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے پاس "ظنون" قیاسات اور تجربات ضرور ہوتے ہیں۔ مگر مخالف احتمالات کی پرچھائیاں ان کو اسی طرح دھندلا بنائی رکھتی ہیں کہ یقین کا نور اسے میسر نہیں آتا، وہ اطمینان قلب سے محروم رہتا ہے جب یقین اور اطمینان کی دولت خود اسے میسر نہیں ہوتی تو وہ دوسروں کو یہ دولت کہاں سے بخش سکتا ہے۔ مؤرخ کے پاس روایات کا ذخیرہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر لبسا اوقات اصول مسلمہ کے طور پہ یہ بھی تسلیم ہوتا ہے کہ "دروغ برگردنِ راوی" سائنس کے انکشافات نے بہت سے فکری نظریات اور "تھیوریوں" کو مشاہدہ کی حیثیت دے دی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کو اعتراف ہے کہ کائنات کے رازہائے سربستہ سے وہ ابتک پوری طرح واقف نہیں ہو سکے ہیں۔ ہر ایک راز کے تحت میں ایسے بہت سے راز ہیں جن کے صحیح انکشاف کیلئے نسل انسانی کو ابھی صدیاں گذارنی ہونگی، لہذا جو کچھ آج کہا جا رہا ہے وہ آخری فیصلہ نہیں ہے۔

نبی کی بہت بڑی خدمت اور نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم ترین احسان یہ ہوتا ہے کہ وہ نوع انسانی کو یقین و اذعان کی وہ بیش بہا دولت عطا کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی دولت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، پھر یہ یقین ان بنیادی باتوں کے متعلق ہوتا ہے جو انسان کی "تعمیر شخصیت" کیلئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کا کوئی مادی ذریعہ آج تک ایجاد نہیں ہوا مثلاً کائنات عالم اور نظام قدرت کے اس پورے کارخانہ میں جو ہمارے سامنے ہے، انسان کی حیثیت کیا ہے وہ قطعاً آوارہ و آزاد ہے یا اس کو جواب دہی کرنی ہوگی، موجودہ زندگی کا تعلق مابعد الموت سے کیا ہے۔ موت فنا محض ہے یا اسکی حقیقت انتقال ہے یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جانا۔ اگر انسان ایک ایسی ابدی حقیقت ہے جو موت سے وہ فنا نہیں ہوتی تو بعد الموت اس کو کیا کرنا ہوگا کس طرح کرنا ہوگا۔ جب تک ان جیسی بنیادی باتوں کے بارے میں یقین اور وثوق پیدا نہ ہو۔ نہ جد و جہد اور حرکت عمل کا رُخ صحیح ہو سکتا ہے۔ اور نہ عمل اور سعی میں یکسانیت اور استقامت پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اسکی شخصیت تعمیر سے قطعاً محروم رہتی ہے۔ آپ ایک تصور قائم کیجئے، شلاً کسی نبی کی تعلیم سامنے نہ ہو صرف فلاسفہ کی تحقیقات اور موشگافیاں ہوں، پھر حق کا کوئی متلاشی انہیں چند سوالات کے متعلق جو مثالی طور پہ بیان کئے گئے ہیں ان سے

اطمینان حاصل کرنا چاہے۔ تو کیا کبھی یہی نور اطمینان کی مسرت اور دلجمعی اس کو میسر آسکتی ہے۔؟ ہاں ایسی مثالیں ضرور ہیں کہ انہیں سوالات میں جو غلطاں و پیچاں بھتے اور تلاش و جستجو کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے، ان کو روشنی نظر آئی اور پھر وہ اس روشنی ہی کے ہو گئے لیکن یہ روشنی فلسفہ یا سائنس کی نہیں تھی بلکہ وہ روشنی ہی تھی جو زیر بحث ہے۔ جس کی کرن شمع نبوت کی لو سے پھوٹتی ہے۔

مختصر یہ کہ لفظ شاہد نے ایک طرف خود نبی کے اذعان و یقین کی شہادت دی اور دوسری جانب ہر ایک داعی کو رہنمائی کر دی کہ اس کو دعوت اسی چیز کی دینی چاہئے جس کی صداقت کا اس کو اس طرح یقین ہو جیسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یا اپنے کانوں سے سن رہا ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ جس کی دعوت دے اسکو بلا کسی جھجک کے ایسے یقین اور وثوق کے ساتھ بیان کرے جس طرح ایک انسان خود اپنے مشاہدہ کو اذعان و یقین کی پوری قوت سے بیان کیا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکار جس بات کی دعوت دیتے ہیں اسکی شان یہی ہوا کرتی ہے اور اسی لئے وہ اس کے مقابلہ اور مخالفت پر ایک مصیبت کو انگیز کرتے اور ہر ایک قربانی کو برداشت کرنے کیلئے تیار رہا کرتے ہیں۔

مبشراً۔ بشارت دینے والا، خوشی سنانے والا۔ جب نبی یقین اور اذعان کی دولت بخش رہا ہے تو یہ بہت بڑی بشارت اور مژدہ جانفزا ہے، ان خستہ جان تشنہ کاموں کیلئے جو تلاش حق میں اپنی عمریں صرف کر رہے ہیں، اور جان عزیز کی تمام آسودگیاں اس جستجو میں قربان کر رہے ہیں، یہی ان کے سوکھے ہونٹوں کو حق و صداقت کے آب حیات سے تر کریگا اور انکے مرجھاتے ہوئے دلوں پر اطمینان کا سایہ رکھیگا۔ لیکن جو لوگ خالی الذہن ہیں یا جو طالب حق ہیں مگر ان کی طلب پیاس کی حد تک نہیں پہنچی۔ ان کے دلوں میں حق و صداقت کا بیج بونے یا اگر وہ کسی درجہ کی طلب رکھتے ہیں تو اس طلب کو بڑھانے اور تلاش جستجو کی حد تک پہنچانے کیلئے یہی ہو سکتا ہے کہ سزا اور عذاب، کی باتیں ان کو سنائی جائیں اور اس آفت اور وبال سے انکو خوف زدہ کیا جاوے۔ جو دنیا یا آخرت میں ان پر پڑ سکتا ہے۔ مگر آیت کریمہ میں لفظ مبشر پہلے لایا گیا ہے۔ جس کا اشارہ یہ ہے کہ نبی اور داعی کا پہلا کام یہ ہے کہ سہمانے اور خوفزدہ کرنے کی بجائے بشارت کے پہلو کو مقدم رکھے۔ مایوس کرنے کی بجائے اس کو مانوس کرے اور پرامید بنائے۔ خوفزدہ انسان کا عمل قہری اور جبری ہوتا ہے۔ اس میں امنگ اور حوصلہ نہیں ہوتا۔ زندگی اور ترقی کیلئے حوصلہ اور امنگ کی ضرورت ہے نبی کی دعوت پیغام زندگی ہے۔ پس اسکی تعلیم میں بشارت

کا انداز نمایاں ہوتا جاتا ہے، تاکہ قوم کے قالب بے جان میں زندگی پیدا ہو اور فروغ پائے۔ عذاب کی بات اس وقت ہے جب اس بشارت سے سرتابی کر کے وہ خود عذاب کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

آپ نے سنا ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی اجتماع میں جس میں صرف آل ہاشم کے افراد کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دعوت اسلام پیش فرمائی۔ یہ فرمایا تھا میں وہ بات پیش کر رہا ہوں کہ اس جیسی بات کسی عربی نوجوان نے عرب کے سامنے آجتک نہیں کی۔ اس میں دنیا کا بھی فائدہ ہے، اور دین کا بھی۔ اس پر عمل کیا جاوے تو پوری دنیا عرب کے سامنے سر نیاز خم کرے گی، آخرت کی کامیابی کے ساتھ دنیا کی کامرانیاں بھی عربوں کو حاصل ہونگی اس تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم یا آتش دوزخ کا نام تک نہیں لایا۔ بلکہ صرف عروج و ترقی کی بشارت بھی سنائی۔ یہی کام داعی حق اور مبلغ شریعت کا ہے۔ نقصان سے پہلے فوائد سناتے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

نذیر: "ڈر سنانے والا" خطرہ سے آگاہ کرنے والا۔ شاہی فرامین ہوں یا جمہوری حکومتوں کے قوانین ان میں قوت و طاقت سزا کی دھمکی سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری پر عمل نہ کیا گیا تو دفعہ ۱۸۸ کے بموجب ۶ ماہ تک کی قید اور ایک ہزار تک جرمانہ کی سزا دی جائے گی۔ مگر قرآن شریف میں نبی یا داعی کیلئے جو الفاظ لائے گئے ہیں وہ دھمکی رعب اور دہشت انگیزی کے تصور سے پاک ہیں۔ قرآن پاک میں مختلف عنوانوں[1] سے بتا دیا گیا ہے کہ نبی پولیس افسر یا کلکٹر کی حیثیت نہیں رکھتا کہ مجرموں کو سزا دلوائے۔ یا سزا دینے کی کوشش کرے۔ نبی پدر مہربان یا مشفق استاد اور مربی ہوتا ہے، جو نوع انسانی کو جو اس کے اہل و عیال کے درجہ میں ہوتی ہے۔ بڑے کریکٹر کے نتائج بد سے آگاہ کرتا ہے۔ بیشک خوف اور ڈر کی بات یہاں بھی کہی جاتی ہے۔ مگر دھمکی کے انداز میں نہیں بلکہ خیر خواہ کے انداز میں جو اپنی آوارہ منش اولاد کو بہت ہی درد بھرے انداز میں بار بار سمجھاتا ہے کہ اسکی آوارگی کے نتائج کیا ہوں گے۔ قانون کے متعلق عام محاورہ یہ ہے کہ وہ "گونگا بہرہ" ہوتا ہے، اس کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کی زد میں کون آرہا ہے اور کس کو کتنا نقصان یا نفع پہنچ رہا ہے۔ انصاف پسند اور پابند قانون "حاکم" کے متعلق بھی یہی محاورہ

---

[1] لست علیھم بمسیطر (غاشیہ) وما ارسلناک علیھم حفیظاً۔ (نساء)

ہے کہ وہ "عقیم" اور بانجھ ہوتا ہے، جو پدرانہ شفقت کی دستگیری سے محروم اور ناآشنا ہوتا ہے لیکن مہربان باپ نہ گونگا بہرہ ہوتا ہے، نہ عقیم اور ناآشنا درد۔ بلکہ اس کے دل کا ہر ایک ریشہ دردمند ہوتا ہے، وہ اپنی اولاد کی آوارگی سے ہر وقت کڑھتا رہتا ہے اور اسکی کڑھن اس پر نہیں ہوتی کہ اولاد اسکی خدمت کیوں نہیں کرتی وہ اس کے حق میں لاپرواہ اور گستاخ کیوں ہے بلکہ اسکی کڑھن اس پر ہوتی ہے کہ اس گستاخی اور لاپرواہی کے نہایت خراب نتیجے اسکی اولاد کے سامنے آنے والے ہیں۔ وہ سمجھاتا ہے کہ ان حرکتوں کا نتیجہ تمہارے سامنے آنے والا ہے۔ وہ بہت خراب اور بھیانک ہوگا۔ باپ کا دل اس بھیانک نتیجہ کے تصور سے لرزتا ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات وہ اپنے قابو میں نہیں رہتا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اولاد اس کا کہنا نہیں مانتی وہ اسکو کہنے اور سنانے میں اپنی پوری ہمت صرف کر دیتا ہے۔ اسی کہنے اور سنانے اور نتائج بد سے آگاہ کرنے کا نام "انذار" ہے۔ پس منذر وہ پدر مشفق ہے، جو اپنی اولاد کو اسکی کج روی کے نتائج بد سے بار بار آگاہ کر رہا ہے۔ (باقی آئندہ) ■■

انوار الحق سہمی ایم اے، ایل ایل بی، ایم ای ڈی

ڈاکٹر سبزواری کے جواب میں

کیا اسلامی سوشلزم کی بنیاد قرآن کا فلسفۂ حیات ہے

قسط ثانی

ڈاکٹر سبزواری نے اس سے آگے "اسلامی سوشلزم" کے حق میں ایک دلچسپ دلیل دی ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ "اجتماعیت اسلام کی روح ہے" انہوں نے نماز اور حج سے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ اجتماعی ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ جب معاد یعنی اُخروی معاملات میں شانہ بشانہ کام کرتے ہیں تو معاش یعنی مادی ضرورتوں کی تحصیل میں ایک دوسرے سے کٹ جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان لوگوں کی ایک بنیادی غلطی یہی تو ہے کہ اسلام کو سراسر اجتماعیت کا علمبردار سمجھا رہا ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام نہ تو کلی اجتماعیت ہے اور نہ یکسر انفرادیت۔ جس پہلو سے بھی دیکھا جائے اس میں اقدارِ حیات کسی بھی انتہائی صورت میں نہیں پائی جاتیں جس سے زندگی کی دوسری کوئی قدر سکڑ کر بے جان ہو کر رہ جائے، عبادات، اخلاق، سیاست، قانون، معیشت، غرض ہر شعبہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کافی وسعت کا ایک حسین امتزاج اور ایک سنہری وسط پایا جاتا ہے۔

وکذالک جعلنٰکم اُمّۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ۔ " اور اس طور پر ہم نے تمہیں اُمّتِ وسط بنایا تاکہ تم نوعِ انسانی پر گواہ بن کر رہو " (البقرہ، ۱۴۳)

مقامِ وسط ہی بیشک نکتۂ عدل ہوتا ہے۔ اسلام کا یہی ایک وصف اتنا درخشندہ اور حیات انگیز ہے کہ اس کی خوبیوں اور اس کے مضمرات پر جتنا غور و فکر کیا جائے۔ یہ وصف اتنا ہی تابندہ تر نظر آتا ہے۔ مختلف اور اکثر متضاد اقدارِ حیات کو کامیابی سے سمونا تو ایک طرف رہا، انسان بیچارے کے تو بس میں یہ بھی نہیں کہ ان اقدار کو الگ الگ سے کہیں ان کا نکتہ عدل متعین کر سکے۔ یونان کے فلاسفہ سے لیکر آج تک مفکرین "سنہری وسط" (GOLDEN MEAN) کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں۔ خالقِ کائنات نے اپنی ربوبیت کی کمال رحمت سے انسان کی رہنمائی اپنے آخری رسولؐ کے ذریعہ اس نظامِ زندگی کی طرف کی ہے جس میں تمام اقدارِ حیات فرداً فرداً بھی پوری نشو و نما پاتی ہیں اور مجموعی ترکیب میں بھی لاثانی توازن و اعتدال کے ساتھ سمو دی گئی ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر سبزواری نے تان اس نکتے پر توڑی ہے کہ "صحیح بات یہ ہے، جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ روزی میں سب برابر کے حقدار ہیں۔" اس کے ثبوت میں موصوف نے قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ پیش کیا ہے، اور فنِ تحقیق کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے سورہ اور رکوع یا آیت کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ بہرحال پہلے موصوف کا نقل کردہ ترجمہ سن لیجئے:

> "اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں برتری دی ہے، جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی زیرِ دستوں کو نہیں لوٹاتے کہ سب اس میں برابر کے حقدار ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف تشریح کرتے ہیں کہ: "روزی میں برتری خاص اسباب کی پیداوار ہے، عدل کا تقاضا ہے کہ مساوات ہو، اصلاً سب برابر اور روزی میں برابر کے حقدار ہیں۔ لفظ ردّ (لوٹانے) سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے کے حق پر زبردستی قبضہ کر لیا گیا ہے۔ غاصب کا فرض ہے کہ حق کو حقدار کی طرف لوٹائے۔"

اب ذرا متعلقہ آیت کا متن سنئیے:

واللہ فضّل بعضکم علی بعضٍ فی الرزق فما الذین فُضّلوا برآدی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم فھم فیہ سوآء ط افبنعمۃ اللہ یجحدون

یہ آیت سورۃ النحل کے دسویں رکوع اور چودھویں پارے کے سولہویں رکوع کی پہلی آیت ہے

اس کا سیاق و سباق (CONTEXT) دیکھیے تو ادنیٰ ترین شک و شبہ کے بغیر اور پوری وضاحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کا مضمون ملتا ہے۔ یہ ایک مسلسل بیان کی جڑی ہوئی کڑی ہے، اور سارے بیان میں پے در پے مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے کہ کس طرح خدا اپنی ذات و صفات میں یکتا و بے ہمتا ہے۔ یہ آیت ان کئی مثالوں میں سے ایک تمثیل پیش کرتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پہ رزق کے معاملہ میں فضیلت و برتری بخشی ہے، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنی برتر روزی کو اپنے زیردستوں میں بانٹ کر انہیں برابر سرابر کر ڈالیں۔ جب حالت یہ ہے تو پھر یہ کفرانِ نعمت کیوں کرتے ہیں اور کیوں اللہ کے ساتھ کسی کو سہیم و شریک ٹھہراتے ہیں، ان کی عقل بھی عجیب ہے کہ جب یہ واقعہ ہے کہ یہ خدا کے دئیے ہوئے رزق میں خود اپنے کسی غلام کو شریک کر کے اسے اپنا ہم سطح بنانے کو تیار نہیں تو یہ کیا تماشا ہے کہ خدا کے اختیار و اقتدار کے بارے میں اس وہم میں مبتلا ہو بیٹھے ہیں کہ اس میں اس کا کوئی نہ کوئی غلام حصہ دار ہے؟

قرآن کے فلسفۂ حیات کا مرکز و محور باری تعالیٰ کی توحید ہے، خالص نتھری ہوئی اور بے مثال توحید، سورج سے زیادہ روشن اس حقیقت کو انسان کی کم نگاہی اور کور ذوقی نے تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی ہر منزل پہ سمجھنے میں خطرناک ٹھوکریں کھائیں ہیں، اور اسی ایک عظیم مغالطے سے وہ تباہ کن حادثوں کا شکار ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے جگہ جگہ اور مختلف پیرایوں میں اس حقیقتِ کبریٰ کی نشاندہی کی ہے اور اس انداز سے کی ہے کہ یوں لگتا ہے، گویا انگلی پکڑ پکڑ کر گڑھوں سے بچایا جا رہا ہے، توحید کو دل و دماغ میں اتارنے کی خاطر خوشنما اور رنگا رنگ مثالوں کی مہکتی کیاریاں نئی جگہ ملتی ہیں، ان مثالوں میں وہ مثال جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، محکمی اور محبوبیت کی ایک خاص شان رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسے سورۃ الروم کی آیت ۲۸ میں ذرا سے مختلف انداز میں دہرایا گیا ہے۔

سورۃ النحل کی مذکورہ آیت کا یہ مطلب و مفہوم اس کے سیاق و سباق سے نکلتا ہے۔ اور یہی مطلب و مفہوم جمہور فقہا اور مفسرین نے پیش کیا بھی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "بیان القرآن" (مطبوعہ تاج کمپنی) میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے "تفسیر عثمانی" (مطبوعہ تاج کمپنی) میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے "تفسیر ماجدی" (مطبوعہ تاج کمپنی) میں یہی مطلب و مفہوم مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ میں بالترتیب ان کے بیانات کے ضروری حصے پیش کرتا ہوں۔

بیان القرآن :- " اور (آگے توحید کے ساتھ شرک کا قبح ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں

سنو کہ) اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعضوں کو بعضوں پر رزق (کے بارہ) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور کسی کو غلام بنا دیا کہ اس کو مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو دے نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے۔ (کہ ان کے پاس مال بھی ہے اور غلام بھی ہیں۔) وہ (لوگ) اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہو جاویں (کیونکہ اگر غلام رکھ کر دیا تو مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہی مالک رہیں گے اور اگر آزاد کر کے دیا تو مساوات ممکن ہے، مگر وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلام اور مساوات ممکن نہیں، اسی طرح یہ بت وغیرہ جب باعتراف مشرکین خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں، تو باوجود مملوک ہونے کے معبودیت میں خدا کے مماثل کیسے ہو جاویں گے۔ اس میں شرک کی غایت تقبیح ہے کہ جب تمہارے غلام تمہارے شریک رزق نہیں ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کے شریک الوہیت کیسے ہو سکتے ہیں) کیا (یہ مضامین سنکر) پھر بھی (خدائے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدائے تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے۔) انکار کرتے ہیں۔

تفسیر عثمانی :- یعنی خدا کی دی ہوئی روزی اور بخشش سب کے لئے برابر نہیں بلحاظ تفاوتِ استعداد و احوال کے اس نے اپنی حکمتِ بالغہ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کسی کو مالدار اور با اقتدار بنایا جس کے ہاتھ تلے بہت سے غلام اور نوکر چاکر ہیں، جن کو اسی کے ذریعہ سے روزی پہنچتی ہے۔ ایک وہ غلام ہیں جو بذاتِ خود ایک پیسہ یا ادنیٰ اختیار کے مالک نہیں۔ ہر وقت آقا کے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں، پس کیا دنیا میں کوئی آقا گوارا کرے گا کہ غلام یا نوکر چاکر جو بہر حال اسی جیسے انسان ہیں بدستور غلامی کی حالت میں رہتے ہوئے اس کی دولت، عزت، بیوی وغیرہ میں برابر کے شریک ہو جائیں۔ غلام کا حکم تو شرعاً یہ ہے کہ بحالتِ غلامی کسی چیز کا مالک بنایا جائے تب بھی نہیں بنتا۔ آقا ہی مالک رہتا ہے۔ اور فرض کرو آقا غلامی سے آزاد کر کے اپنی دولت وغیرہ میں برابر کا حصہ دار بنا دے تو مساوات بیشک ہو جائے گی لیکن اس وقت وہ غلام غلام نہ رہا۔ بہرکیف غلامی اور مساوات جمع نہیں ہو سکتی۔ پھر غضب ہے کہ خالق و مخلوق کو معبودیت وغیرہ میں برابر کر دیا جائے۔ اور ان چیزوں کو جنہیں خدا کی مملوک سمجھنے کا اقرار خود مشرکین بھی کرتے تھے۔ (إلا شريكا هو لك

تملکہ وما ملک) مالکِ حقیقی کا شریک و سہیم ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ کیا منعم حقیقی کی نعمتوں کا یہ ہی شکریہ ہے کہ جس بات کے قبول کرنے سے خود ناک بھوں چڑھاتے ہو، اس سے زیادہ قبیح وشنیع صورت اس کے لئے تجویز کی جاتی ہے۔ نیز جس طرح روزی وغیرہ میں حق تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی سب کو ایک درجہ میں نہیں رکھا۔ اگر علم و عرفان اور کمالات نبوت میں کسی ہستی کو دوسرے سے فائق کر دیا تو خدا کی اس نعمت سے انکار کرنے کی بجز ہٹ دھرمی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

تفسیر ماجدی:۔ "آیت سے اس حقیقت پر پوری طرح روشنی پڑ گئی کہ مال و دولت میں عدم مساوات فطری و طبعی ہے اور تقسیم دولت میں مساوات کا دعویٰ ہی سرے سے بے بنیاد اور خلاف فطرت ہے۔ فقہا اور فقہائے مفسرین نے آیت سے مالک اور غلام کے درمیان نفیٔ مساوات صراحت کے ساتھ نکالی ہے۔ قال ابوبکر قد تضمنت الآیۃ انتفاء المساواۃ بین المولیٰ وبین عبدہ فی الملک (جصاص)۔ (بلکہ ایسی تقسیم تو فطرتِ بشری پر ایک بار ہے۔) آیت جڑ کاٹ رہی ہے۔ اہل باطل کے اس نظام معاشی کی جس کا پرانا نام مزدکیت اور جدید نام سوشلزم یا (انتہائی صورتوں میں) کمیونزم ہے شرک پر اصرار کئے جانا عین نعمت الٰہی سے انکار کرنا ہے۔"

ڈاکٹر سبزواری نے پہلے آیت مذکورہ کے ترجمے میں چابکدستی دکھائی اور خود اسی ایک آیت کے الگ سیاق و سباق کے خلاف (حقدار ہو جائیں" کی بجائے) "حقدار ہیں" کے الفاظ میں ترجمہ پیش کر کے مطالب کا رخ اپنی طرف موڑا اور پھر اسی ٹیکنیک کو بڑے پیمانے پر استعمال کر کے پوری آیت کو اس کے متصل سیاق و سباق سے اکھاڑ کر رکھ دیا۔ اس کارروائی کے بعد آیت کی اس غرض سند تشریح کے لئے راستہ بالکل صاف ہو گیا جو انہیں درکار تھی۔ اس طرح انہیں یہ ظاہر کرنے کا موقع مل سکا کہ جن کے پاس دوسروں کی نسبت زیادہ رزق ہے وہ دراصل غاصب ہیں اور "غاصب کا فرض ہے کہ حق کو حقدار کی طرف لوٹائے" یہاں پر موصوف ذرا حالات کی رعایت کر گئے ہیں۔ کوئی شخص یہ امید نہیں کر سکتا کہ ایک چور، ایک ڈاکو، ایک غاصب اپنے احساس "فرض" کے تحت دوسروں کا مال اُن کے حوالے کر دے گا۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ بات "غاصب کا فرض" کہہ کر چھوڑ دی گئی ہے۔؟ ڈاکٹر سبزواری اور حقیقتوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے آنکھیں کیسے پھیر سکیں گے کہ ابھی اس ملک میں سوشلزم کے لئے فضا اتنی سازگار نہیں ہوئی کہ روٹی کے نام پر کم رزق والوں کو زیادہ رزق والوں کے خلاف بھڑکا کر طبقاتی تصادم برپا کر دیا جائے، اسلامی اقدار و اخلاق کو تباہ کر دیا جائے اور مارکس کی بے دین اور خونیں مادیت کو ملک پر جبر و تشدد کے ساتھ مسلط کر دیا جائے۔

ابھی وقت لگی لپٹی رکھنے کا ہے۔

بہرحال بات کیا تھی اور ڈاکٹر سبزواری نے اُسے کہاں پہنچا دیا! لیکن یہ کوئی محض اتفاق بھی نہیں۔ وہ اور ان کی طرزِ فکر کا گروہ بھی عریاں نہیں تو نیم عریاں سوشلزم کے لئے اور کبھی نقاب پوش سوشلزم کے اثر و نفوذ کو بڑھانے پھیلانے کے لئے ہر جتن کر رہا ہے۔ علمی، ادبی اور سیاسی، ہر محاذ پر مختلف داؤں کے ساتھ کام کیا جا رہا ہے۔ "اسلامی سوشلزم" کا جھلملاتا پردہ بھی اسی غرض سے بنایا گیا ہے کہ اس پردے کے پیچھے مناسب حد تک زمین ہموار اور قوت فراہم کر لی جائے تو پھر نقاب نوچ کر نکلیں گے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد پر "رجعت پسندی" کا لیبل چسپاں کر کے اُسے فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ یہ لوگ چونکہ یہ یقین سے کے چلے ہیں کہ سوشلزم انسانی دکھوں کے لئے اکسیر ہے، لہذا ان میں سے بعض تو سوشلزم کو ابھی سے کھلم کھلا سینے سے لگا لیتے ہیں، لیکن بعض فی الحال نقاب پوشی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس دوسری طرز میں کچھ لوگ وہ ہیں جو اسلام پر احسان کرنے کی فکر میں ہیں کہ سوشلزم کو درآمد کر کے ان دونوں کو آپس میں جوڑ دیا جائے تاکہ بقول ان کے اسلام میں دورِ جدید کا ساتھ دینے کی جو صلاحیت نہیں تھی، وہ پیدا کر دی جائے۔ پھر کچھ لوگ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ سوشلزم کی ظاہری کامرانیوں کو دیکھتے ہوئے خود اسلام کے اندر سے سوشلزم ڈھونڈھ نکالنے کے لئے تاریخ سے صرفِ نظر کرنے اور قرآن و حدیث میں طفلانہ تاویل اور کھلی تحریف کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ خدا جانے اسلام کو سبوتاژ کرنے کا یہ کھیل کب تک کھیلا جاتا رہے گا۔ اس آسمان کے نیچے صدیوں سے نوعِ انسانی کو جاہلی اقدار اور بے دین دیوتوں نے ستا رکھا ہے۔ آخر یہ لوگ کیوں انسان اور اسکی ارتقائی تاریخ سے اتنا سا انصاف برتنے کے بھی روادار نہیں ہیں کہ دنیا کی سٹیج کے کم از کم اس حصے پر خالص اسلامی نظام کے نفاذ اور اسکی لاثانی برکتوں کے ظہور میں مزاحم نہ ہوں جو نام و وجود کے لحاظ سے اکیس برس پہلے اس مقصد کے لئے مختص ہو گیا تھا۔؟ حق سے بغض و عناد کی یہ بڑی ہی خطرناک قسم ہے کہ انسان نہ صرف خود سیدھی راہ پر چلنے سے انکار کر دے بلکہ دوسروں کے اُس راہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچے کہ صراطِ مستقیم کو ہی لوگوں کے سامنے ٹیڑھا کر دکھانے پر تل جائے۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کی سخت مذمت کی ہے۔

اس سلسلے میں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات کو ابھارنے کی مہم میں مسلم معاشرے میں جہاں اور جب بھی اٹھتی ہیں ان میں اب سوشلزم کا ہاتھ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ سفید سامراج اب یہ ہتھکنڈے چھوڑ بیٹھا ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ سفید سامراج

جو ایک عالمی نظریئے کا منظم فلسفہ اپنے پیچھے بہرحال نہیں رکھتا، زیادہ تر اپنی سیاسی اغراض ہی کے لئے ان مہموں کو سہارا دے سکتا ہے۔ اس کے برعکس سرخ سامراج کو یہ کام دہرے مقصد کے لئے کرنا پڑتا ہے۔ اوّل سرخ سامراج کا براہ راست سیاسی مفاد، دوم عالمی نظریات کی حیثیت سے اسلام اور سوشلزم میں رقابت کے پیش نظر۔ سوشلسٹ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات کا ہر وار اسلام کی نظریاتی بنیادوں پر اور امتِ مسلمہ کی قوتِ مدافعت پر وار ہے۔ آپ اگر گرد و پیش پر ذرا سی تحقیقی نگاہ ڈالیں تو آپ اس دلچسپ حقیقت کو فوراً بھانپ لیں گے کہ نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات کو پھیلانے میں سوشلسٹ ہی پیش پیش ہیں اور ان گھٹیا تعصباتی تحریکوں کی سربراہی انہی لوگوں کو حاصل ہے۔ قیامِ پاکستان سے متصلاً قبل کے دنوں کا ایک انگریزی کتابچہ میری نظر سے گزرا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ فلاں علاقہ ہمیشہ خود مختار رہا ہے، اور اب بھی اُسے خود مختار رہنا چاہئے اور یہ کہ دراصل مشترک مفاد تو سب مزدوروں کا ہے نہ کہ سب مسلمانوں کا۔ پھر یہ تو تازہ واقعہ ہے کہ پچھلے دو تین ماہ میں کوچہ و بازار میں یہ کتبے دیکھے گئے اور یہ نعرے سنے گئے کہ "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ!" تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ یہ نعرہ مارکسزم کا، سائنٹفک سوشلزم کا، یا کمیونزم ــــــ ایک ہی فلسفہ حیات کے تین نام ــــــ کا نعرہ ہے۔ لیکن ہمارے یہ مہربان "اسلامی سوشلزم" کو جنم دینے کی خواہش میں شاید یہ کہنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے کہ یہ نعرہ مارکس کی نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بیسویں صدی عیسوی کی تیسری چوتھائی کا نذرانۂ عقیدت ہے! شاید وہ یہ بات کہہ دینے میں بھی کوئی تامل نہیں کریں گے کہ کسی وقت، جو کہا گیا تھا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں وہ محض "رجعت پسندی" اور "جاگیردارانہ سازش" تھی۔

سادہ لوحوں کے سامنے "اسلامی سوشلزم" کے جواز میں ایک اور دلیل جو ڈاکٹر سبزواری نے تو پیش نہیں کی لیکن جو اُن کے ہمنوا بڑے طمطراق سے بیان کرتے ہیں، یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ انفرادی ملکیت کے خلاف تھے۔ ساتھ ہی یہ لوگ، اتنا کیوں نہیں بتاتے کہ حضرت معاویہؓ نے حکومت اپنے بیٹے کو منتقل کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دو مثالیں قرنِ اوّل میں دو مختلف مسئلوں پر منفرد ہیں اور ان کی وجہ سے نہ تو انفرادی ملکیت کو اجماعِ امت نے ناجائز ٹھہرایا اور نہ ہی حکومت کی وراثتی منتقلی کوئی مستحسن نمونہ ٹھہری۔ دونوں انتہائی رجحانات کی واحد استثنائی مثالیں ہیں۔ جو دورِ صحابہؓ میں ملتی ہیں۔ اور دونوں اپنے مخالف کلیات کو ثابت کرتی ہیں، کیونکہ دونوں اسلام کے مجموعی

لہ گو مادیت، بے دین تہذیب اور اخلاق و کردار سے عاری تمدن کو ایک منظم فلسفہ کی حیثیت بہرحال دے چکا ہے۔ (سمیع الحق)

مزاج و نظام سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمتیں ہوں، وہ دونوں جلیل القدر صحابہؓ تھے، لیکن ان معاملات میں انہوں نے جو رائے قائم کی وہ ان کا انفرادی اجتہاد تھا اور بس۔ ان میں سے کسی کو بھی سند اور اتھارٹی کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

مشکل یہ ہے کہ ملت کا بڑا حصہ اَن پڑھ ہے اور جتنا حصہ تعلیم یافتہ ہے بھی اس کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد دینی اور مغربی علوم دونوں سے واقف ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے حوصلہ مندوں کی کمی نہیں جو کھوکھلے مگر خوشنما نعروں کو ذریعہ لوگوں کو اپنے پیچھے کھینچ لانے کا داعیہ رکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ لوگ بالخصوص نوجوان جن کے جوش و ولولہ، فہم و شعور، عزم و استقامت کے ساتھ ہمارے مستقبل کی تعمیر و ترقی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ساری امیدیں وابستہ ہیں، یہ پہچان پیدا کریں کہ کس تبدیلی میں ہمہ پہلو نجات ہے، کونسا نظام ہے جو زندگی کے بیکراں امکانات کو ہم آہنگی سے بروئے کار لا کر انسان کی خودی کی تکمیل کر سکتا ہے، کسی مرکزِ فکر و عمل میں عدل و انصاف کی ساری توانائیاں اور ہمہ گیر توازن و توسط کی تمام خوبیاں جلوہ گر ہیں۔ جس کی جھولی خالی ہو وہ اگر بھیک مانگے تو ایک حد تک قابلِ معافی ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ شخص کاسۂ گدائی لے کر اٹھ کھڑا ہو جس کے اپنے دامن میں کائنات کے سارے خزانے بھر دیئے گئے ہوں تو اس سے بڑھ کر انسانیت کی بدبختی کیا ہو گی۔؟ اس سے بڑی بھول اور کیا ہو سکتی ہے کہ جسے دنیا بھر کو دینے کے لئے عدل کی پوری پونجی دے دی گئی ہو وہ خود اُن سے لینے کے لئے تڑپتا پھرے جن کے ہاتھوں میں ظلم و فساد کے سوا کچھ بھی نہیں۔؟

اب ایک طائرانہ نگاہ اُن نمایاں خصوصیات پر ڈال لیجئے جن کی بدولت اسلام کا نظامِ زندگی اور قرآن فلسفۂ حیات دوسرے تمام نظاموں سے اس طرح ممتاز ہے، جس طرح مٹی کے چراغوں سے سورج۔

۱۔ انسان کا مقصدِ حیات خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ زندگی کی ساری سرگرمیاں اسی مقصد کے تحت اور اسی مقصد کی خاطر اپنا مخصوص مقام و رنگ رکھتی ہیں۔ فرد، خاندان، معاشرے اور پوری نوعِ انسانی کے آپس کے تعلقات اور حقوق و فرائض اسی ایک مقصد کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔

۲۔ سارے انسان اولادِ آدم کی حیثیت سے برابر ہیں۔ رنگ، نسل، زبان، علاقہ، وطن اور دولت کا فرق و اختلاف آپس کے شرف اور تعصب کی بنیاد ہرگز نہیں ہیں۔ شرافت

اور بزرگی کا اصل معیار پرہیزگاری اور تقویٰ ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔

۳- اسلام خدا اور بندے میں براہ راست تعلق قائم کرتا ہے۔ ان معنوں میں کہ درمیان میں برہمنیت اور کلیسائی نظام کی سیڑھیاں نہیں ہیں۔ قیامت کے دن خدا کے حضور اصل جوابدہی ایک ایک انسان کی ہوگی اور مسلمان پر یہ ذمہ داری بھی اسکی انفرادی ذمہ داریوں کے تحت ہی عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی برکتوں کو اجتماعی شکل میں بھی زمین پر پھیلا دے۔

۴- عدل کا نفاذ و قیام ہر ممکن حالت میں ہوگا، حتیٰ کہ دشمنان اسلام تک سے بھی انفرادی و اجتماعی صلح و جنگ کی تمام حالتوں میں عدل ہوگا۔ قانون کی بالادستی ہوگی، اور عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل الگ رکھا جائے گا۔ خلافت راشدہ کی تاریخ تمام حالتوں میں عدل کے قیام کی بے نظیر مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

۵- فرد و اجتماع کے حقوق و ذمہ داریاں ہر میدان میں خدا کی بندگی، آخری رسولؐ کے اتباع اور آپس کی پرسوز اور فداکارانہ ہمدردی پر مبنی ہیں، مادی حرص کی خونیں مسابقت کے لئے یہاں کوئی گنجائش نہیں اور نہ یہاں سرمایہ داری اور سوشلزم جیسی نگہ مغرب کی پیداواروں کی کھپت کا کوئی امکان ہے۔ دولت کی تقسیم نہ سرمایہ داری اور سوشلزم کی طرح مادی فلسفۂ حیات کے تحت ہے اور نہ یہاں ان دونوں میں سے کوئی ایک انتہا پیدا ہوسکتی ہے۔ جہاں سرمایہ داری آزادیٔ فرد کے ذریعہ عدم مساوات پر منتج ہوتی ہے۔ اور سوشلزم بڑی حد تک مادی مساوات کے ساتھ ساتھ فرد کی تمام آزادی چھین لیتا ہے۔ اسلام بیک وقت فرد کی معقول آزادی اور معقول مساوات کا اہتمام کرتا ہے۔ سرمایہ داری میں ارتکازِ دولت کے مواقع ہیں، اسلام میں نہیں۔ ادھر سوشلزم کی جبری مساوات میں افراد کے باہمی تعاون کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں۔ کیونکہ آمریت سب لوگوں کو ایک ہی ڈنڈے سے جانوروں کی طرح خود ہانکتی ہے، اور افراد کے رضاکارانہ تعاون کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔

۶- اسلامی مملکت ہی صحیح معنوں میں رفاہی مملکت ہوتی ہے۔ فرد کی باعزت اسلامی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا سٹیٹ کے اولین فرائض میں داخل ہے، چنانچہ اسلامی مملکت میں بنیادی ضروریات زندگی، مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، علاج اور تعلیم کی کفالت لازماً سٹیٹ کے ذمہ ہے۔ اور اگر افراد کسی وجہ سے خود ان کی دستیابی میں ناکام ہوں تو مملکت کا فرض ہے کہ اس بات کا پورا اہتمام کرے کہ کوئی فرد ان بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے۔ انفرادی اور اجتماعی ملکیت

دونوں کا وجود بیک وقت ملتا ہے ، اور دونوں کے حدود اور دائرہ ہائے کار متعین ہونے کے باوجود کسی حد تک لچکدار ہیں ۔ عام حالات میں انفرادی ملکیت کو عمومی اور اجتماعی ملکیت کو استثنائی پوزیشن حاصل رہتی ہے ۔ بہر حال ، کسب و حرفت کی اُن تمام قانونی اور اخلاقی پابندیوں کے باوجود جو قرآن اور سنّت کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ، اگر کہیں ارتکازِ دولت کی خرابی سر اٹھائے یا بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محرومین کا گروہ پیدا ہونے لگے تو تمام مسنون شرائط کے تحت اجتہاد کے ذریعہ مناسب حل نکالا جا سکتا ہے ۔

۷۔ اسلامی نظام کی عملی تشریح دورِ رسالت اور پھر خلافتِ راشدہ کے تیس سالوں میں مثال و نمونہ کے طور پر ملتی ہے ۔ نئی ضروریات کا حل اگر قرآن و سنّت میں براہِ راست نہ ملتا ہو تو اس دور تک کی مسلّمہ فقہ کے علاوہ مشہور علمائے حق کے اجتہاد و اجتماع سے استفادہ ہوگا ۔

پس قرآن سے " اسلامی سوشلزم " ڈھونڈھ نکالنے کی امنگ اور اسلام کو سوشلزم سے "ہم آہنگ" کر دینے کی آرزو ایک ناروا جسارت ہے ۔ عملاً اسکی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام بذاتِ خود ہر لحاظ سے مکمل ہے ۔ فکر و ایمان کے لحاظ سے ایسا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ یہ طرزِ فکر ایک مکروہ کاسہ لیسی ہے اور اسلام کے خلاف عدم اعتماد کے ووٹ کا درجہ رکھتی ہے ۔

موت العالم

علمی و دینی حلقوں میں یہ اطلاع نہایت رنج سے سنی جائے گی کہ اوکاڑہ کے ممتاز اور معروف عالم دین مولانا ضیاء الدین صاحب فاضل دیوبند تلمیذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا حال ہی میں انتقال ہوا مرحوم مدت سے اوکاڑہ کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب تھے ۔ قرآنِ پاک کا درس محبوب مشغلہ تھا ۔ لڑکیوں کی اصلاح و تعلیم کے لئے ایک مدرسہ بیت صالحات اور عام مسلمانوں کیلئے ایک عید گاہ تعمیر کرائی ۔ الحق کے تمام قارئین سے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے ۔

غمزدہ محمد صدیق ، سلیمان ، حافظ حبیب الرحمٰن

حبیب کاٹن فیکٹری ۔ اوکاڑہ

مغرب کی اسلام دشمنی

تحریر: علامہ محمد اسد صاحب (حال متوطن مراکش)

ترجمہ: محمد معین خاں بی۔ اے (عثمانیہ)

صلیبی روح جہاد اب بھی بہت لطیف پیرایہ میں یورپ پر منڈلا رہی ہے۔ عالم اسلام کے ساتھ آج یورپی تہذیب کا جو رویہ ہے۔ اس پر آپکو اس سخت جان روح کی بہت ہی نمایاں علامتیں ملیں گی۔ اس مضمون میں اس معاندانہ رویہ اور اسلام دشمنی کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ادارہ)

★

مذہبی تضاد و اختلاف کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے جس کے مدنظر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ مغربی تہذیب کی اتباع و تقلید سے اجتناب کریں۔ وہ سبب یہ ہے کہ اس تہذیب کے تاریخی تجربے اسلام کے خلاف ایک انوکھی خصومت کے گہرے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یورپ کو اسلام کے ساتھ یہ مخالفانہ رویہ بھی ایک حد تک اپنے اسلاف کے ترکہ میں ملا ہے۔ اہل یونان و روما ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ روئے زمین پر صرف وہی "مہذب" ہیں۔ اور باقی تمام قومیں بالخصوص وہ جو بحیرۂ روم کے مشرق میں آباد تھیں ان پر یہ لوگ ہمیشہ "وحشی" (BARBARIAN) کا لیبل چپکاتے رہے۔ اسی زمانہ سے اہل مغرب کو بھی یہ یقین ہو چلا کہ تمام نوع بشر پر ان کی نسلی برتری ایک حقیقت مسلّمہ ہے۔ تمام اقوام و ملل سے کم و بیش علانیہ نفرت کا اظہار کرنا، مغربی تہذیب کا شعار ہے۔

اسلام کے تعلق سے مغرب کے جذبات و احساسات کی توضیح کے لئے صرف یہی بات کافی نہیں ہے۔ مغرب اگرچہ تمام "غیر" مذہبوں اور ثقافتوں کو یوں ہی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

لیکن اسلام کے معاملہ میں اسکی اس ناپسندیدگی کے دامن مجنونانہ نفرت کی حدوں سے جا ملتے ہیں۔ اسلام کے خلاف مغرب کی نفرت و عداوت کی جڑیں نہ صرف اسکی عقل وادراک ہی میں پیوست ہیں بلکہ جذبات واحساسات کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ یورپ کے لئے بودھی یا ہندو فلسفہ قابل قبول نہیں ہے تاہم ان فلسفوں کے بارہ میں اس کا ذہنی رویہ ہمیشہ متوازن رہتا ہے۔ لیکن جہاں اسلام پر اسکی نظر پڑی اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا، اور ایک جذباتی تعصب قلب و دماغ پر چھا گیا۔ یورپ کے عظیم المرتبت مستشرقین بجز چند مستثنیات کے تمام کے تمام اپنی ان تحریروں میں جو انہوں نے اسلام پر قلمبند کی ہیں، انتہائی شدید تعصب وعناد میں ملوث نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیقات سے بیشتر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ ایک علمی تحقیقاتی موضوع کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ اسے ایک ایسا ملزم سمجھتے ہیں جو حاکم عدالت کے سامنے کھڑا ہو، ان میں بعض تو ایک ایسے وکیل سرکار کا رول ادا کرتے ہیں جو ملزم پر فرد جرم عائد کرانے پر تلا ہوا ہو، اور بعض ایسے قانونی مشیر کا روپ دھارتے ہیں جسے ذاتی طور پر یہ یقین ہو چکا ہو کہ اس کا موکل حقیقت میں جرم کا مرتکب ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے موکل کے حق میں صرف شدت جرم کو خفیف ثابت کرنے کی نیم دلانہ کوشش کر سکتا ہے، اکثر مستشرقین نے اس سلسلہ میں استخراج و استنتاج کی جو تیکنیک اختیار کی ہے وہ ہمیں ان بدنام مذہبی عدالتوں کی کارروائی کی یاد دلاتی ہے جو کیتھولک کلیسا نے قرون وسطیٰ میں اپنے مخالفوں کے لئے قائم کی تھیں۔ یعنی یہ کہ یہ مستشرقین کبھی بھی کھلے دل سے حقائق وواقعات کا کھوج نہیں لگاتے بلکہ ہر مقدمہ میں شہادت اور متعلقہ واقعات سے وقوف حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنے تعصب کے زیر اثر ایک نتیجہ قائم کر لیتے ہیں، اور پھر اسی نتیجہ سے اپنی کارروائی کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ لوگ شہادت کا انتخاب بھی اپنے اس نتیجہ کے مطابق کرتے ہیں جس پر پہنچنے کا وہ پہلے ہی سے عزم کر لیتے ہیں، اور جہاں من مانے گواہوں کا انتخاب ممکن نہیں ہوتا تو وہ مقدمہ کے سیاق وسباق سے گواہوں کی شہادت کو جدا کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں یا فریق ثانی یعنی مسلمانوں کی جانب سے استغاثہ کی پیش کشی کو کوئی اہمیت دئے بغیر بغض وعداوت کے ایک غیر حکیمانہ جذبہ کے ساتھ اپنے بیانات کی "وضاحت کرنا" شروع کر دیتے ہیں۔

اسلام اور اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی جو مسخ شدہ تصویر ہمیں یورپ کے مشرقیاتی ادب میں دکھائی دیتی ہے وہ دراصل مستشرقین کے اسی مخاصمانہ طریق کار کا نتیجہ ہے۔ حقائق و واقعات کے توڑ مروڑ کا یہ معاملہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ انگلستان، جرمنی،

فرانس، ہالینڈ، اٹلی غرض یورپ کے جس جس ملک میں آپ کو یہ مستشرقین اسلام پر نظرِ کرم فرماتے دکھائی دیں گے۔ وہ سب کے سب اس حمام میں ننگے ہی ننگے نظر آئیں گے۔ اسلام کے خلاف جب کبھی کسی واقعی یا خیالی نقد و احتساب کا موقع ہاتھ آیا، ایک کینہ آمیز مسرت ان مستشرقوں کے دلوں کو گدگدانے لگی۔ یہ مستشرقین کسی طبقۂ متخصصین سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ یہ لوگ تو محض اپنی تہذیب اور اپنے ہی سماجی ماحول کے شارح و ترجمان ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں لازمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کر لینا چاہیئے کہ یورپ کے سارے ذہن پر کسی نہ کسی سبب سے اسلام دشمنی کا کثیف زنگ چڑھا ہوا ہے۔ ایک سبب تو وہ قدیم نظریہ ہو سکتا ہے، جو ساری دنیا کو یورپی اور غیر یورپی میں منقسم کر دیتا ہے۔ دوسرا سبب جس کا اسلام سے بڑی حد تک براہِ راست تعلق ہے وہ آپ کو اوراقِ ماضی میں بالخصوص قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ملے گا۔

متحدہ یورپ اور اسلام کے مابین پہلا عظیم تصادم ــــــ صلیبی معرکہ ــــــ اور یورپی تہذیب کا آغاز دونوں ایک ہی زمانہ میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ یورپی تہذیب نے جو ہنوز کلیسا کی ہم نوا تھی، روما کی بربادی کی کئی تاریک صدیوں کے بعد پہلی دفعہ اپنا ایک الگ راستہ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ادب نو اور ابھار کے ابتدائی مرحلہ سے گذر رہا تھا۔ فنونِ لطیفہ اس گہری نیند سے بیدار ہو رہے تھے جو گاتھوں اور ہنوں کی جنگجویانہ ترکِ وطنی نے ان پر طاری کر رکھی تھی۔ یورپ کو قرونِ وسطیٰ کے صدرِ اول کی نا تہذیب زندگی کے نرغے سے نکلے ہوئے کچھ زیادہ دن گذرنے نہیں پائے تھے۔ وہ ایک نئے ثقافتی شعور سے ابھی ابھی بہرہ ور ہوا تھا جس کی بدولت اسکی قوتِ احساس میں چند در چند اضافہ ہو گیا تھا۔ یہی وہ انتہائی نازک دور تھا، جبکہ عالم اسلام کے مقابلہ میں صلیبی معرکے کھڑے کئے گئے تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ صلیبی معرکوں سے پہلے بھی مسلمانوں اور یورپیوں میں لڑائیاں ہوئیں مثلاً عربوں کی فتح اسپین و سسلی، جنوبی فرانس پر عربوں کا حملہ، لیکن یہ لڑائیاں اس وقت ہوئیں جبکہ یورپ اپنے نئے ثقافتی شعور سے ہنوز بہرہ مند نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ان کی نوعیت کم از کم یورپی نقطۂ نگاہ سے مقامی تنازعات سے کچھ مختلف نہ تھی اور ان کی اہمیت کا اندازہ پورے طور پر نہیں ہو سکا تھا۔ یہ صلیبی معرکے ہی تھے جنہوں نے آنے والی کئی صدیوں کے لئے اسلام کے ساتھ یورپی رویّہ کا تعیّن کیا تھا۔ یہ معرکے قطعی طور پر فیصلہ کن نوعیت کے حامل تھے۔ یہ یورپ کے دورِ طفولیت میں پیش آتے تھے۔ اور یہ ایسا دور تھا کہ یورپ کے مخصوص ثقافتی اوصاف پہلی دفعہ دنیا کو اپنی جھلک دکھلا رہے تھے اور ہنوز اپنے مخصوص سانچوں

میں ڈھلتے جا رہے تھے ـــــ افراد کی طرح اقوام کے ذہنوں پر بھی بچپن کے غیر معمولی تاثرات شعوری یا لاشعوری طور پر مدت العمر برقرار رہتے ہیں۔ یہ تاثرات لوح ذہن پر کچھ اتنے گہرے نقش ہو جاتے ہیں کہ پختہ عمر کے تجربے بھی جن میں جذبات سے زیادہ سنجیدگی کی کارفرمائی ہوتی ہے، انہیں مشکل ہی سے محو کر سکتے ہیں اور کلی طور پر تو شاذ ہی مٹا سکتے ہیں۔ صلیبی معرکوں کے نقش کردہ تاثرات کا بھی یہی معاملہ تھا۔ ان معرکوں نے یورپ کی عوامی نفسیات پر انتہائی عمیق نقش بٹھائے تھے، انہوں نے اپنے وقتوں میں جوش و ولولہ کا ایسا عالم گیر طوفان بپا کیا تھا کہ یورپ کی گذشتہ تاریخ کا کوئی واقعہ بھی ان سے لگا نہیں کھا سکتا ـــــ مدہوشی و خود فراموشی کا ایک سیلاب تھا جو سارے براعظم پر امڈ آیا تھا۔ انبساط و مسرت کی ایک موج تھی جو کم از کم کچھ عرصہ کے لئے ملک قوم اور فرقہ کی رکاوٹوں کو بھی عبور کر گئی تھی۔ یہ تاریخ کا پہلا موقع تھا کہ یورپ کو اپنے تئیں ایک اتحاد ہونے کا یقین پیدا ہوا تھا ـــــ اور یہ اتحاد عالم اسلام کی مخالفت میں تھا! کسی مبالغہ کے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید یورپ کو صلیبی معرکوں کے ولولوں نے جنم دیا تھا۔ ان معرکوں سے پہلے یورپ رہ گذر تاریخ پر انگلوسکسینوں جرمنوں، فرانسیسیوں، فارمنوں، اطالویوں اور ونڈیزیوں کے قافلوں کی صورت میں گامزن نظر آتا ہے۔ لیکن صلیبی معرکوں کے زمانہ میں مغربی تہذیب کا ایک نیا تصور تخلیق کیا گیا جو یورپ کی تمام قوتوں کا مشترک تصور تھا اور یہ اسلام کے خلاف نفرت و عداوت کا جذبہ تھا۔ جو اس نوزائیدہ تصور کی پرورش و پرداخت کر رہا تھا۔

تاریخ کی یہ ایک بہت بڑی ستم ظریفی ہے۔ کہ مغربی دنیا کا اجتماعی تصور ـــــ نظام عقل ـــــ پہلی دفعہ ان محرکات کی بدولت حرکت آشنا ہوا ہے، جن کی پشت پناہی سرتاسر مسیحی کلیسا نے کی تھی۔ درآنحالیکہ مغرب کے بعد کے کارنامے صرف اسی ذہنی بغاوت کی بدولت حیطۂ امکان میں آسکے جو ہر اس چیز کے خلاف بپا کی گئی تھی جس کا کلیسا مؤید و حامی تھا اور اب بھی ہے۔ بحالات کا یہ ارتقاء مسیحی کلیسا اور اسلام دونوں کے نقطۂ نظر سے المناک ہے۔ کلیسائی نقطۂ نظر سے اس لئے المناک ہے کہ اس قدر حیرت انگیز آغاز کے بعد وہ یورپی ذہن پر اپنا تسلط باقی نہ رکھ سکا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اس لئے المناک ہے کہ صلیبی معرکوں نے مختلف صورتوں میں مختلف طریقوں سے اسلام کو اپنی تباہ کاریوں کا ہدف بنایا۔

ان ناقابل بیان سفاکیوں، بربادیوں اور ذلتوں کی خاک سے جو صلیب کے معصوم حامیان و نے ان اسلامی علاقوں پر گرائی تھی جن پر وہ پہلے قابض ہو گئے تھے۔ اور بعد میں ان سے ہاتھ دھو

لینا پڑا، اس دیرینہ عداوت کے زہریلے بیج نے اپنا سر نکالا جس نے مشرق و مغرب کے تعلقات کو آج تک تلخ بنا رکھا ہے، ورنہ دیکھا جائے تو اس قسم کے جوش و جذبہ کی واقعتاً کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگرچہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب دونوں اپنی روحانی بنیادوں اور سماجی عزائم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، لیکن یہ یقینی بات ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برت سکتی ہیں اور دوستانہ ماحول میں رہ سکتی ہیں۔ اس قسم کا امکان نہ صرف نظری طور پر فراہم کیا گیا ہے بلکہ عملی طور پر بھی مسلمانوں کی جانب سے باہمی رواداری اور احترام کی مخلصانہ خواہش کا اظہار ہمیشہ کیا جاتا رہا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے شارلیمین کے پاس اپنا سفیر اسی خواہش کے تحت بھجوایا تھا نہ کہ اس خواہش کے تحت کہ فرانکوں کی دوستی سے کوئی مادی فائدہ اٹھایا جائے۔

یورپ اس زمانہ میں تہذیبی اعتبار سے اس قدر پست تھا کہ وہ اس موقع کی کماحقہٗ قدر پہچان نہ سکا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یورپ نے اس موقع کو ناپسندیدہ نگاہوں سے بھی نہیں دیکھا۔ مگر اس کے بعد یکایک افق مغرب پر صلیبی معرکوں کا عفریت نمودار ہو گیا، اور اس نے اسلام اور مغرب کے باہمی تعلقات کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھ دیں۔ تاریخ عالم میں قوموں کے پاس بیشمار لڑائیاں ہوئیں، اور مرور وقت کے ساتھ یہ لڑائیاں فراموش کر دی گئیں۔ بیشمار عداوتیں بھی معرض وجود میں آئیں، اور یہ عداوتیں دوستی و مودت میں مبدل ہو گئیں۔ لیکن صلیبی معرکوں کی پھیلائی ہوئی غلاظت صرف ہتھیاروں کی جھنکار تک محدود نہیں رہی، ان معرکوں نے سب سے پہلے ذہنوں کو تاکا اور مسیحی کلیسا کے زیر اہتمام اسلامی تعلیمات و عقائد کی عمداً بگاڑی ہوئی تصویروں کو پیش کر کے عالم اسلام کے خلاف یورپ کے قلب و دماغ کے ریشہ ریشہ میں نفرت و تعصب کا زہر دوڑا دیا۔ یہ صلیبی معرکوں ہی کا زمانہ تھا جبکہ یورپ کے ذہن میں یہ مہمل اور بیہودہ تصور داخل ہوا کہ اسلام ایک نفس پرستی اور بہیمانہ تشدد کا مذہب ہے جس میں تزکیہ باطن کی بجائے صرف ظاہری رسوم کی بجا آوری کی جاتی ہے۔ اور اس تصور نے اپنے قدم جما لئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ دیار یورپ میں پہلی دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "مہوند" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

بہرحال اسلام کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا گیا۔ صلیبی جذبۂ جہاد کے نتائج بہت جلد یورپ میں کہیں اور نمودار ہو گئے۔ یہ ہسپانیہ کی سرزمین تھی جہاں کے مسیحیوں کو اپنی گردنوں سے "مشرکوں کا جوا" اتار پھینکنے کے لئے اسی جذبہ نے جنگ و پیکار پر ابھارا تھا۔ اگرچہ ہسپانوی مسلمانوں کی تباہی کو اتمام تک پہنچانے کے لئے صدیاں گذر گئیں۔ لیکن اس جنگ کا سلسلہ کچھ

اتنا طویل رہا کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محض اسی وجہ سے یورپ کے سینے میں اسلام دشمنی کا جذبہ روز بروز شدید اور پائدار ہوتا چلا گیا اور سرزمین ہسپانیہ سے مسلمانوں کے استیصال پر منتج ہوا جو ایسی سفاکانہ اور بہیمانہ تعذیب کے ذریعہ روبہ عمل لایا گیا کہ دنیا نے اس سے پہلے ایسا خونیں ڈرامہ کہیں نہیں دیکھا تھا۔ مسیحیوں کی اس فتح پر سارے یورپ میں خوشی کے جشن منائے گئے۔ اگرچہ اس فتح کا بعد میں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ قرونِ وسطیٰ کی جہالت و بربریت کے ہاتھوں دنیا کی ایک نہایت ہی شاندار ثقافت ملیامیٹ ہو کر رہ گئی۔

حادثۂ ہسپانیہ کی گونج ابھی پوری طرح ختم نہ ہو پائی تھی کہ ایک تیسرے بڑے اہم حادثہ نے عالم اسلام اور مغربی دنیا کے باہمی تعلقات پر ایک شدید ضرب لگائی — یہ ترکوں کی فتح قسطنطنیہ تھی۔ بازنطیم کی لوح وجود پر قدیم یونان و روما کے جو چند سحرناک نقوش باقی رہ گئے تھے ان میں یورپ کے قلب و نظر کے لئے اب بھی تھوڑی بہت کشش موجود تھی۔ بازنطیم "وحشیوں" کے خلاف یورپ کا ایک مضبوط حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مکمل طور پر مسخر ہو جانے کے ساتھ مسلم سیلاب کے لئے یورپ کا دروازہ دفعتاً کھل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والی شعلہ زار صدیوں کے دوران اسلام کے خلاف یورپ کی عداوت نہ صرف ثقافتی اہمیت کا مسئلہ بن گئی بلکہ سیاسی اہمیت کا بھی اور اس صورتِ حال کے باعث یہ عداوت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

بایں ہمہ یورپ کو صلیبی معرکوں سے بڑا فائدہ پہنچا۔ نشاۃ ثانیہ یعنی علوم و فنون کا احیاء اور اسلامی بیشتر عربی ماخذوں سے اس احیاء کی وسیع پیمانہ پر خوشہ چینی بڑی حد تک مشرق و مغرب کے باہمی مادی ارتباط کی مرہون منت ہے۔ اس مادی ارتباط کی بدولت یورپ ثقافتی میدان میں عالم اسلام سے کہیں زیادہ فائدہ میں رہا۔ لیکن اس نے اسلام کے ساتھ اپنی دیرینہ نفرت کی تخفیف کی صورت میں مسلمانوں سے اپنی دائمی ممنونیت کا اظہار آج تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس یہ نفرت متادِ وقت کے ساتھ بڑھتی اور ایک رواج کی صورت میں پائیدار ہوتی چلی گئی۔ جہاں لفظ "مسلم" کا تذکرہ آیا اور یہ نفرت اس پر اپنا سایہ ڈال گئی۔ یورپ کے عام محاورہ میں نفوذ کر گئی۔ یورپ کے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی۔ سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یورپی ثقافت میں کئی تغیرات آئے اور چلے گئے لیکن نفرت اسلام کا جذبہ غیر متغیر ہی رہا۔ اصلاحِ دین کا زمانہ آیا۔ یورپ متعدد مذہبی گروہوں

میں اس طرح منقسم ہوگیا کہ ہر گروہ نے دوسرے گروہ کے خلاف ہتھیار اٹھا لیئے۔ ان میں کوئی بھی چیز وجہ اشتراک نہ تھی البتہ ایک نفرت اسلام کا جذبہ ہی ایسا تھا جو ان سب میں ہمیشہ مشترک رہا۔ اس کے بعد ایک اور زمانہ آیا جبکہ یورپ سے مذہبی احساس بتدریج زائل ہوتا چلا گیا، مگر نفرت اسلام کا جذبہ علی حالہ برقرار رہا۔ یہ نہایت ہی عجیب وغریب حقیقت ہے کہ فرانس کا عظیم فلسفی اور شاعر والٹائر جو مسیحیت اور اس کے کلیسا کا بدترین دشمن تھا، اسے بھی اسلام اور بانی اسلام سے ایسی نفرت تھی جو جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے چند عشروں کے بعد ایک ایسا زمانہ آیا جبکہ علمائے مغرب اجنبی ثقافتوں کا مطالعہ کرنے لگے اور انہیں ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن اسلام کے معاملہ میں وہی روایتی نفرت ان کی عالمانہ تحقیق و تفحص میں ایک غیر حکیمانہ تعصب کی صورت میں دبے پاؤں گھس آئی اور ثقافت کی وہ خلیج جو بدقسمتی سے تاریخ نے دنیائے یورپ اور عالم اسلام کے مابین کھودی تھی وہ جوں کی توں باقی رہی۔ اسلام کی توہین و تذلیل یورپی فکر کا جزو لاینفک بن گئی۔ یہ سچ ہے کہ ازمنہ جدیدکے اولین مستشرقین وہ مسیحی مبلغین تھے جو اسلامی ملکوں میں اپنا کاروبار چلا رہے تھے۔ ان لوگوں نے تعلیمات اسلام اور تاریخ اسلام کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ نہایت ہی بدوضع اور بعید از حقیقت ہیں۔ قیاس یہ کیا جاتا ہے، کہ مشرکوں کے ساتھ یورپیوں کا رویّہ انہی تصویروں کے زیر اثر متعین ہوا تھا۔ لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ یورپ کا یہ ذہنی رویّہ اب بھی بدستور قائم ہے۔ حالانکہ عرصہ ہوا کہ مشرقیاتی علوم مسیحی مبلغوں کے اثر ونفوذ سے آزاد ہو چکے ہیں، اور اب کوئی ایسا غلط قسم کا مذہبی انہماک باقی نہیں رہا جسے اس ذہنی رویہ کے حق میں بطور اعتذار پیش کیا جاسکے۔ اسلام کے خلاف ان مستشرقوں کا بے جا تعصب محض ایک رجعت پسندانہ جبلت اور ایک خصوصی جذبہ ہے جو اس تاثر پر مبنی ہے جسے صلیبی معرکوں نے اپنے تمام عواقب کے ساتھ قدیم یورپ کی لوح ذہن پر مرتسم کیا تھا۔

کوئی سائل یہ پوچھ سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ایسا پرانا بغض جو مذہبی بنیاد پر اٹھا ہو اور مسیحی کلیسا کے روحانی تفوق و استیلاء کے سہارے عالم امکان میں آیا ہو، یورپ میں اس وقت بھی اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے جبکہ وہاں احساس مذہبی ایک قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اس قبیل کے سوالات اور الجھاوے ایک ماہر نفسیات کے لیئے قطعاً باعث حیرت نہیں ہیں۔ کیونکہ ماہر نفسیات بخوبی جانتا ہے کہ ایک شخص اپنے معتقدات مذہبی کو جن کی تعلیم اسے

بچپن میں ملی ہو۔ یکسر فراموش کر سکتا ہے۔ لیکن ان معتقدات سے مربوط ایک آدھ مخصوص عقیدۂ باطل ایسا بھی ہوتا ہے جو اس شخص کے دل میں کچھ اسطرح پیوست و ممزوج ہو جاتا ہے کہ عقل تمام عمر اس کے خلاف اپنی توضیحات و دلائل پیش کرتی رہ جاتی ہے، اور وہ انہیں قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ اسلام کے ساتھ یورپ کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ اسلام کے ساتھ یورپ کے بغض کی تہ میں جو احساس کارفرما تھا وہ اگرچہ مادہ پرستانہ نظریہ حیات کے لئے اپنی جگہ خالی کر گیا لیکن وہ دیرینہ بغض یورپ کی فضائے ذہنی میں ایک تحت شعوری عامل کی صورت میں اب بھی بدستور باقی ہے۔ صلیبی روح جہاد اب بھی --- بہت لطیف پیرایہ میں --- یورپ پر منڈلا رہی ہے۔ عالم اسلام کے ساتھ آج یورپی تہذیب کا جو رویہ ہے، اس پر آپ کو اسی سخت جان روح کی بہت ہی نمایاں علامتیں ملیں گی۔

مسلم حلقوں میں آئے دن یہ بات وثوق کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ ماضی کی شدید معرکہ آرائیوں کی بناء پر اسلام کے خلاف یورپ کے دل میں جو نفرت بیٹھ گئی تھی وہ اس زمانہ میں بتدریج ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ تک دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یورپ کے اسلام کی طرف مائل ہونے کے قرائن و علامات بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے مسلمان تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ یقین کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جبکہ سارا یورپ حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گا۔ ہم لوگوں کے نزدیک جو اس بات کے قائل ہیں، کہ دنیا میں ایک اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو غیر جانبدارانہ نقد و احتساب کے امتحان میں پورا اتر سکتا ہے، لوگوں کا یہ ایقان غیر معقول نہیں ہے۔ مزید برآں تو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ دنیا کے سارے لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ جہاں تک مغربی تہذیب کا تعلق ہے اسلام کی تعمیم صرف اس وقت ممکن ہو سکے گی جبکہ ہولناک قسم کے مسلسل سماجی اور ذہنی انقلابات کے ہاتھوں یورپ کی موجودہ ثقافتی خود پسندی کے پرخچے اڑ چکے ہوں گے اور یورپ کی ذہنیت اس حد تک متغیر ہو چکی ہو گی کہ وہ زندگی کی مذہبی تعبیر کو قبول کرنے پر آمادہ و تیار ہو جائیگی۔ آج مغربی دنیا اپنی مادی تحصیلات کی چاہ میں سرتا پا غرق اور اپنے اس اعتقاد میں یکسر کھوئی ہوئی ہے کہ ایک ہی مقصود و مدعا جو ہماری جد و جہد کے لائق اور سعی و کاوش کے قابل ہے وہ آسودگیٔ حیات اور صرف آسودگیٔ حیات ہے۔ مغرب کی مادہ پرستی اور فکر کے مذہبی رجحان کے ساتھ اسکی مخالفت کے بارہ میں بعض رجائیت پسند مسلمان یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان دونوں چیزوں

کی شدّت میں روز بروز کمی ہوتی جارہی ہے۔ حالانکہ واقعتاً یہ یوماً فیوماً زور پکڑتی جارہی ہے۔

بعض رجائیوں کا کہنا ہے کہ جدید سائنس فطرت کے مرئی چوکھٹے کے پیچھے ایک غیر تغیر پذیر تخلیقی قوت کے وجود کی قائل ہوتی جارہی ہے۔ ان لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ صورت حال دنیائے مغرب میں ایک نئے مذہبی شعور کی طلوعِ سحر کی دلیل ہے۔ لیکن یہ تو محض ایک مفروضہ ہے جو یورپی سائنسی فکر کے بارہ میں ان رجائیوں کی غلط فہمی کی غمازی کرتا ہے۔ دنیا کا کوئی سنجیدہ سائنس دان نہ تو کبھی اس امکان کا انکار کرسکا اور نہ کرسکتا ہے کہ کائنات اپنی اصل وابتداء کے اعتبار سے کسی نہ کسی واحد حرکت انگیز علّت کی رہین منّت ہے۔ لیکن سوال صرف یہی ہے اور ہمیشہ رہا ہے کہ اس "علّت" سے کون کون سے اوصاف منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ تمام ماورائی مذاہب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ علت ایک ایسی قوّت ہے جو شعور مطلق اور بصیرت مطلقہ کی مالک ہے۔ ایک ایسی قوت جو خالق ہے اور کائنات پر ایک منصوبہ د مقصد کے مطابق حکمرانی کر رہی ہے اور خود ہر قسم کے قانونی تقیدات سے مبّرا ہے۔ اس ساری تشریح کو صرف ایک ہی لفظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ " اللہ " ہے۔ لیکن جدید سائنس نہ تو اس تشریح کو ماننے کے لئے تیار ہے اور نہ اس پر مائل۔ وہ اس تخلیقی قوت کے شعور و اختیار ـــــ دوسرے لفظوں میں الوہیت ـــــ کے سوال کو بالکل کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس بارہ میں سائنس کے رویّہ کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے، اور نہ اسے جاننے کا میرے پاس کوئی سائنسی ذریعہ ہے۔ شاید یہ فلسفہ مستقبل میں وجودیت یا لا ادریت کی سی صورت اختیار کرجائے جس میں روح اور مادہ، مقصد اور وجود، خالق و مخلوق سب ایک ہیں اور ایک ہی سے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کا عقیدہ اسلام کے ایجابی تصور باری کی طرف مزید ایک قدم متصوّر ہوسکتا ہے، کیونکہ اس عقیدہ سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مادہ پرستی کو خیر باد کہہ دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود مادہ پرستی تعقل کی ایک بلند اور لطیف تر سطح پر صعود کر گئی ہے۔

سچ پوچھو تو یورپ اسلام سے اتنا دور کبھی نہ تھا جتنا کہ وہ آج نظر آرہا ہے، ہوسکتا ہے کہ ہمارے مذہب کے خلاف اسکی عملی عداوت روبہ تنزل ہو۔ لیکن اسکی وجہ اسلامی تعلیمات کی قدرشناسی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کی بڑھتی ہوئی ثقافتی کمزوری اور اس کا انتشار ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ اسلام سے خوف زدہ رہتا تھا، اور اس خوف نے اسے اسلام

کے رنگ کی ہر شئے کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، حتیٰ کہ خالص روحانی اور سماجی معاملات بھی اس سلوک سے بری نہ تھے۔ لیکن ایسے وقت جبکہ اسلام یورپ کے سیاسی مفادات کے مخالف عامل کی حیثیت سے اپنی بہت کچھ اہمیت کھو چکا ہے۔ تو قدرتی طور پر یورپ کا خوف بھی کچھ کم ہو گیا اور اس کے ساتھ عداوت اسلام کی وہ پہلے کی سی شدت بھی باقی نہیں رہی۔ اگر ان دونوں کی نمود و فعالیت میں قدرے کمی واقع ہو گئی ہے تو اس سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ یورپ باطنی طور پر اسلام سے زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال تو اسلام کے بارہ میں یورپ کی بڑھتی ہوئی بے التفاتی پر دلالت کرتی ہے۔

مغربی دنیا نے اپنا ذہنی رویہ قطعاً نہیں بدلا۔ یہ رویہ مذہبی تصور حیات کا اب بھی اتنا ہی شدید مخالف ہے جتنا کہ پہلے کبھی تھا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس یہ باور کرنے کا کوئی تسلی بخش ثبوت موجود نہیں ہے کہ یورپ کے رویہ میں مستقبل قریب میں کوئی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ رہے مغرب میں اسلامی تبلیغی اداروں کی موجودگی اور چند یورپیوں یا امریکیوں کا قبول اسلام؛ وہ اس بارہ میں قطعاً کوئی حجت و دلیل نہیں ہو سکتے۔ ایسے دور میں جبکہ مادہ پرستی مغربی زندگی کے ہر رہ گذر پر قابض و متصرف ہے، اگر یہاں وہاں چند روحانی تجدید و احیاء کے آرزومند افراد مذہبی تصورات پر مبنی کسی عقیدہ کی تعلیم کو شوق و ذوق سے سن رہے ہوں تو یہ محض ایک امر فطری ہے۔ مغرب میں یہ بات صرف اسلامی تبلیغی اداروں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہاں آپ کو مسیحیت کے بیشمار صوفی فرقے ملیں گے جو "تجدید دین" کے رجحانات کے حامل ہیں۔ تھیوسوفی تحریک ملے گی جو کافی طاقتور ہے۔ بودھی عبادت خانے اور تبلیغی ادارے بھی ملیں گے جنہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے۔ بودھی تبلیغی ادارے بھی انہی دلائل کی بناء پر جو مسلم تبلیغی ادارے پیش کرتے ہیں، یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ (اور کر رہے ہیں) کہ یورپ بدھ مذہب سے زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ چند افراد کے اسلام یا بودھ مت قبول کر لینے سے تو یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ ان میں سے کسی مذہب نے مغربی زندگی پر واقعتاً کوئی نمایاں اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ بلکہ اس بارہ میں یہ کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ یہ ادارے لوگوں کے دلوں میں مذہب کی جو لگن لگا سکے ہیں وہ انتہائی درجۂ اعتدال سے بھی آگے بڑھنے نہیں پائی اور یہ صورت بھی محض اس جذب و کشش کی وجہ سے پیدا ہو سکی جو

کسی ملک کے تخیل پرست ذہنوں کو ایک نئے اور اجنبی مسلک میں نظر آیا کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں چند مستثنیات بھی ہیں۔ اور نو واردانِ مذہب میں چند افراد ایسے بھی ملیں گے جو صداقت کے سچے متلاشی ہیں۔ لیکن کسی تہذیب کے ظاہری رُخ کو بدلنے کے لئے صرف چند مستثنیات سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے برعکس اگر ہم مذہب کے حلقہ بگوش ہونے والوں کی تعداد کا موازنہ ان مغربیوں کی تعداد سے کریں جو روزانہ مارکسیت یا فاسطیت جیسے خالص مادہ پرستانہ سماجی مسلکوں میں انبوہ در انبوہ شامل ہوتے چلے جارہے ہیں، تو ہم جدید مغربی تہذیب کے میلان کا زیادہ صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

ہو سکتا ہے کہ بڑھتی ہوئی سماجی اور معاشی بے چینی اور پے در پے عالمی جنگیں جن کی وسعتوں اور سائینسی ہولناکیوں سے دنیا اس وقت تک ناواقف ہے۔ مغربی تہذیب کی خود پسندی کو ایک ایسے مہیب و مکروہ راستہ پر ڈالدیں کہ اہلِ مغرب سبک سر بن کر سنجیدگی کے ساتھ روحانی سچائیوں کی تلاش و جستجو شروع کردیں۔ اس وقت ارضِ مغرب میں اسلام کی کامیاب تبلیغ و اشاعت کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسا انقلاب ہنوز افق مستقبل کے عقب میں مستور ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا اسلامی موثرات کے بارہ میں ایسی باتیں کرنا کہ وہ تسخیرِ روحِ یورپ کے جادہ پر چل پڑے ہیں۔ ایک خطرناک قسم کی خود فریبانہ رجائیت ہے۔ اس لئے کہ یہ دل فریب بھی ہے اور سہل بھی اور اس میں ہمیں اس حقیقت سے باز رکھنے کا میلان بھی پایا جاتا ہے کہ ثقافتی اعتبار سے اس دنیا میں ہم مسلمانوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ درآنحالیکہ عالمِ اسلام میں مغربی موثرات نے بے انتہا قوت حاصل کر لی ہے۔ اور یہ کہ ہم سب تو محو خواب ہیں اور مغربی موثرات ہر جگہ اسلامی معاشرہ کی بنیادوں کو کھوکھلا اور اسے تباہ و برباد کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسلام کی اشاعت و توسیع کی تمنا کرنا اور بات ہے اور اس تمنا پر جھوٹی امیدوں کے قلعے تعمیر کرنا اور بات ہے۔

ہم تو اقصائے عالم میں نورِ اسلام کے پھیلنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور خود ہمارے قریبی گرد و پیش کا یہ حال ہے کہ نوجوانانِ اسلام ہمارے مقصد اور ہماری امید سے منہ موڑتے چلے جا رہے ہیں۔

■■

جناب احمد سعید صاحب۔ ایم اے، تاریخ، پولیٹیکل سائنس
لیکچرار ایم اے او کالج لاہور

مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
اور
مولانا اشرف علی تھانویؒ

استاد اور شاگرد کا رشتہ

ہمارے اکابر کو طریق کار اور سیاسی میدان میں اختلاف مسلک کے باوجود ایک دوسرے کے حقوق اور مراتب کا کتنا پاس تھا اور ایک دوسرے کی عظمت و محبت کتنی ملحوظ رہتی اس کی ایک جھلک اس مضمون میں دکھائی دیگی۔ واقعی یہ لوگ اشداء علی الکفار رحماء بینہم کا مصداق تھے۔ اخلاص اور خیرخواہی پر مبنی یہ اختلاف ہرگز ایسا نہیں جسے افسانہ بنایا گیا، اور نہ یہ اس قابل ہے کہ اس پر کسی تحزب اور گروہ سازی کی عمارت کھڑی کر دی جائے۔

(ادارہ)

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمود حسن کا رشتہ آپس میں استاد شاگرد کا تھا۔ مولانا تھانوی نے اپنے استاد کی سوانح ذکر محمود کے نام سے تحریر کی جس سے دونوں کے تعلقات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ دونوں رہنما ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن دونوں حضرات کا مسلک تحریک خلافت کے متعلق مختلف تھا۔ جیسا کہ خود مولانا تھانوی نے فرمایا۔ "سبحان اللہ حضرت دیوبندی کی عالی ظرفی قابل دید ہے کہ میرا مسلک تو حضرت کے مسلک سے ظاہراً مختلف تھا، ڈھکا چھپا نہ تھا مگر حضرت ذرا بھی دل گیر نہ ہوتے۔"

اس اختلاف کے باوجود دونوں کے ذاتی تعلقات کا اندازہ مولانا تھانوی کے ملفوظات پڑھنے سے ہوتا ہے کہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا کس قدر احترام کرتے تھے۔

تحریک خلافت کے دوران بعض لوگوں نے یہ مشہور کیا کہ مولانا تھانوی مولانا محمود حسن کے مخالف ہیں، جب اسکی اطلاع آپ کو ملی تو آپ نے اپنے رسالہ "التنویر" میں لکھا۔ "اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں، نہ حضرت قدس سرہٗ سے مجھے یا میرے کسی متعلق کو مخالفت ہے، نہ میں حضرت مولانا کا نعوذ باللہ مخالف ہوں، بلکہ جس قدر محبت عظمت حضرت قدس سرہٗ کی میرے دل میں ہے، خدا اسکو بہتر جانتا ہے۔ مجھ پر حضرت کی مخالفت کا الزام سراسر بہتان ہے۔" مولانا تھانوی اپنے احباب سے اپنی مجالس میں مولانا محمود حسن کو جو کہ شیخ الہند کے نام سے مشہور تھے، شیخ الاسلام اور شیخ العالم کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ فرمایا: "تم بڑے فخر سے کہتے ہو کہ اسیر مالٹا تھے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ امیر مالٹا تھے۔ تم کہتے ہو شیخ الہند تھے، ہم کہتے ہیں شیخ العالم تھے۔ اب بتلاؤ مولانا کا زیادہ معتقد کون ہے۔ جس چیز کو ہم ذریعہ نجات سمجھتے ہیں، یعنی بزرگوں سے تعلق، بحمداللہ وہ حقیقت میں ہم کو حاصل ہے، تمہارے زبانی دعووں سے کیا ہوتا ہے۔

فرمایا۔ "حضرت محمود حسن کو جب کوئی شیخ الہند کہتا ہے تو میرے دل پر ایک تیر سا لگتا ہے۔ اس لئے کہ شیخ الاسلام اور شیخ العالم کو شیخ الہند کہتے ہیں۔ بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں حضرت کی تنقیص معلوم ہوتی ہے۔ ان مدعیان محبت نے حضرت کی شان کو پہچانا ہی نہیں۔ ہند کوئی اسلامی سلطنت ہے کہ جسکی وجہ سے شیخ الہند کہنے پر فخر ہے۔"

فرمایا: "حضرت استاذی مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی مجسم اخلاق تھے۔" فرمایا "اکثر لوگ حضرت دیوبندی کو شیخ الہند فخراً لکھتے ہیں، مجھ کو اس قدر ناگوار ہوتا ہے کہ شیخ العالم کو شیخ الہند کہتے ہیں، بس افسوس ہے انکی سمجھ پر اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ وائسرائے کو کوئی کانسٹیبل کہے۔ یہ اہانت نہیں ہے، یہ تعریف ایسی ہے جسکو مولانا رومی کہتے ہیں ؎

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست　　　ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

اگر ایسا ہی تھا تو شیخ العرب کہنا چاہیے تھا۔ نسبت بھی کی تو کفر کے ملک سے، یہ کون سے فخر کی بات ہے۔

حضرت مولانا محمود حسن کی تواضع کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا: "میں جب کبھی دیوبند گیا تو بہت کم اتفاق ایسا ہوا کہ میں حاضری میں سبقت کر سکا ہوں، ورنہ خود تشریف لاتے تھے۔"

فرمایا: "حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی میرے استاد ہیں، قبلہ ہیں، کعبہ ہیں، مگر مجھے آج تک یہ معلوم نہیں کہ حضرت مولانا کے کسقدر اولاد ہے، نہ یہ ہمارے بزرگوں کا طریق ہے۔

جب مولانا محمود حسن صاحب حج کیلئے تشریف لے گئے تو مولانا تھانوی کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ مولانا نے حدیث شریف کا دورہ شروع کروایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ان کو اس بات کا انتظار تھا کہ مولانا ہندوستان سے جائیں اور ہماری دوکان چمکے۔ فرمایا " اگر میں مولانا کے سامنے ہی شروع کر دیتا تو کونسا گناہ تھا، بلکہ حضرت مولانا ہی سب سے زیادہ خوش ہوتے۔"

فرمایا : "حضرت مولانا کی ذات بڑی ہی عجیب ہے۔ مدعیان محبت نے تو انکو پہچانا ہی نہیں۔ ہمارے اعتقاد میں تو وہ شیخ الہند والسند والعرب والعجم ہیں۔"

تحریک خلافت کے دوران مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے مولانا تھانوی کو خط لکھا اور کہا " میں بڑی مشکل میں ہوں۔ میں کیا کروں کہ میں دو بڑوں (مولانا محمود حسن اور مولانا تھانوی) کے درمیان ہوں۔ مولانا تھانوی نے جواب میں فرمایا۔ " مولانا ہمارے سب کے بڑے ہیں۔ مولانا ہی کے فرمانے پر عمل کرنا چاہئے، اگر میں تنہا ہوتا تو میں خود بھی حضرت کے ساتھ ہوتا۔"

فرمایا : " اگر مولانا مجھ کو تحریک میں شامل ہونے کے لئے حکم فرماتے تو چونکہ میں چھوٹا تھا، اس لئے مجبور ہو جاتا، مگر حضرت کو کبھی اس کا خطرہ بھی نہ ہوا بلکہ خیال آیا تو یہ کہ اپنے ایک خاص خادم پانی پتی سے یہ فرمایا کہ " بھائی اختلاف تو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ لاؤ پھر میں ہی کچھ اپنی رائے سے رجوع کر لوں۔"

فرمایا : " مولانا ہمارے مدرسۃ العلوم کانپور میں جلسہ دستار بندی کیلئے تشریف لائے، میں نے وعظ کے لئے عرض کیا۔ فرمایا مجھے وعظ کہنا نہیں آتا۔ میں نے کہا حضرت وعظ تو کہنا ہی پڑے گا، فرمایا تمہارے وعظ سے لوگ مانوس ہیں، اور پسند کرتے ہیں، تمہارا وعظ ہی مناسب ہوگا۔ اور میرے بیان سے لوگ خوش نہ ہوں گے۔ اس سے میرا تو کچھ نہ جائے گا، تمہاری ہی اہانت ہوگی کہ انکے استاد ایسے بے علم ہیں۔ میں نے عرض کی حضرت اس سے تو ہمارا فخر ہوگا۔ کہ ان کے استاد ایسے ہیں۔"

مولانا محمود حسن کے بارہ میں ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا : " حضرت مولانا محمود حسن کے متعلق فلاں مولوی صاحب راوی ہیں، انہوں نے اپنے کانوں سے سنی اور اپنے کانوں سے دیکھی ہے کہ جس وقت حضرت مالٹا سے تشریف لائے تو بمبئی کی بندرگاہ پر استقبالی گروہ بہت زیادہ تعداد میں موجود تھا۔ حضرت مولانا اور دو مولوی صاحب ایک موٹر میں تھے اور بعض لیڈر بھی موجود تھے۔ جس وقت موٹر چلا تو ایک دم اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور اس کے بعد گاندھی کی جے اور محمد علی شوکت کی جے اور مولوی محمود حسن کی جے کے نعرے بلند ہوئے۔ حضرت نے شوکت علی کا دامن پکڑ کر کہا کہ یہ کیا؟ اس پر شوکت علی نے کچھ خیال نہ کیا تو حضرت نے دوبارہ سختی سے فرمایا کہ اسکو بند کرو۔ اس پر

شوکت علی نے کہا کہ حضرت بتے کے معنی فتح ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو رام رام کہا کرو۔ اور جو کچھ بھی ہو یہ کفر شعار ہے۔ اسی طرح حضرت نے دیوبند اور اس کے قرب وجوار میں اپنے اہتمام سے گائے کی قربانیاں کروائیں۔"

فرمایا "ہم اپنے حضرات کی شان اور انکی حق پرستی اور بے نفسی دیکھی، ایسا کسی کو بھی نہ دیکھا۔ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے تو میں بھی بغرض زیارت دیوبند حاضر ہوا تھا۔ حضرت نے بڑی ہی شفقت فرمائی، وہ باتیں اس وقت یاد آتی ہیں تو ان حضرات کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔"

یہ تو حضرت تھانویؒ کے جذبات حضرت محمود حسن کے متعلق اب استاد کی رائے شاگرد کے متعلق ملاحظہ ہو کہ حضرت محمود حسن مولانا تھانوی کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے حضرت دیوبندی سے شکایت کی کہ مولانا تھانوی اس تحریک خلافت میں شریک نہیں تو اس پر مولانا محمود حسن نے فرمایا "ہم کو اس پر بھی فخر ہے کہ ایسی ہمت کا آدمی بھی ہم میں سے ہے کہ جس نے تمام دنیا کی پرواہ نہ کی، جو اسکی رائے میں حق ہے اس پر استقلال سے قائم ہے، کسی کے دباؤ یا اثر کو ذرا برابر حق کے مقابلہ میں قبول نہ کیا۔"

فرمایا: "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ کو وحی ہوتی ہے۔ کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وحی سے کہہ رہا ہوں، میری بھی ایک رائے ہے۔" ایک اور شخص کے جواب میں فرمایا: "ہمیں اس پر بھی فخر ہے کہ ایسا شخص جو ہندوستان بھر سے متاثر نہ ہوا وہ بھی ہماری جماعت میں سے ہے۔"

ایک صاحب سے جبکہ مولانا محمود حسن مالٹا سے دیوبند تشریف لائے تھے تو اس زمانہ میں بھی مولانا تھانوی بھی زیارت کے لئے دیوبند حاضر ہوئے تو حضرت سے فرمایا: کہ حضرت وہ (مولانا تھانویؒ) آیا ہوا ہے، اس وقت حضرت اس مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کر دیں۔" حضرت تھانویؒ نے فرمایا: "یہ حضرات کیسے عادل ہوتے ہیں، فرمایا کہ وہ میرا لحاظ کرتا ہے اس لئے میری گفتگو کرنے سے رائے گا نہیں، تنگی ہوگی سو میں تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ نیز گفتگو کرنے سے رائے نہیں بدلتی۔ واقعات سے بدلا کرتی ہے۔ باقی اس پر یقین ہے کہ جب رائے بدلے گی اسکا اعلان کر دے گا۔"

ایک مرتبہ کچھ لوگ حضرت مولانا محمود حسن کی بیٹھک میں مولانا تھانوی کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ حضرت کے کانوں میں وہ الفاظ پڑ گئے، حضرت نے سب کو ڈانٹا اور فرمایا "تم ایسے شخص کی شان میں گستاخی کر رہے ہو جسکو میں اپنا بڑا سمجھتا ہوں۔"

مولانا تھانویؒ ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "یہ الفاظ میری ذات سے ارفع و اعلیٰ ہیں محض حضرت کی شفقت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ یہ حضرت کا اپنے چھوٹوں سے برتاؤ تھا۔"

حضرت تھانویؒ نے فرمایا: "حضرت دیوبندی کے ایک خاص معتقد اور معتمد مولوی صاحب مجھ سے روایت کرتے ہیں کہ مرض الموت میں جب حضرت دہلی میں تھے اور اختلاف کی خبریں کانوں میں پڑنے لگیں تو حضرت نے فرمایا: "لاؤ میں ہی کچھ اپنی رائے سے ہٹ جاؤں یہ اختلاف تو کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔"

رامپور میں ایک صاحب نے مولانا تھانویؒ کو اپنے بچے کے ختنہ کی تقریب میں بلایا وہاں پر مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا محمود حسن صاحب بھی موجود تھے۔ جب مولانا تھانویؒ، وہاں پہنچے تو دعوت کا بہت بڑا کھیڑا کیا ہوا تھا۔ مولانا تھانویؒ کو یہ بات ناپسند گذری اور آپ وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ اس واقعہ کے متعلق بعض لوگوں نے مولانا خلیل احمد سے سوال کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ تو اس میں شریک رہے اور مولانا تھانویؒ چلے گئے تو انہوں نے فرمایا: "بھائی انہوں نے تو تقویٰ پر عمل کیا اور ہم نے فتویٰ پر عمل کیا۔ اور جہاں ان کا اور ہمارا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کی بنا یہی ہوتی ہے: بعض لوگوں نے مولانا محمود حسن سے بھی یہی سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا: "عوام کی حالت سے جتنا وہ واقف ہیں اتنا ہم نہیں۔"

ان الفاظ کے بعد مولانا تھانوی فرماتے ہیں "اصل جواب وہی تھا جو حضرت مولانا محمود حسن نے دیا۔ مولانا خلیل احمد کا جواب تو اضع کا جواب تھا۔"

دنیا کی مختلف زبانوں میں

قرآنِ کریم کے تراجم

مرتبہ : مجلس معارف القرآن دیوبند

تراجم قرآنی کے وسعت پذیر موضوع پر کی گئی جمع شدہ مواد حرف آخر کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا اسلئے ان اعداد میں اضافہ ناگزیر ہے۔ (ادارہ)

نمبر شمار	زبان	تعداد	نمبر شمار	زبان	تعداد	نمبر شمار	زبان	تعداد
۱	اردو	۹۲	۱۸	سنسکرت	۲	۳۶	سکاٹسرین	۲
۲	فارسی	۵۲	۱۹	گورمکھی	۱	۳۷	ارگونین	۱
۳	ہندی	۱۸	۲۰	بنگلہ	۶	۳۸	روسی	۶
۴	گجراتی	۹	۲۱	کنڑی	۱	۳۹	ڈینش	۴
۵	عبرانی	۵	۲۲	سندھی	۲	۴۰	بلغاری	۱
۶	ترکی	۵	۲۳	پنجابی	۶	۴۱	سویڈش	۳
	مزید تحقیق طلب ہیں		۲۴	مرہٹی	۱	۴۲	پولش	۳
۷	جاوی	۱	۲۵	ٹمیل	۱	۴۳	پرتگالی	۴
۸	انڈو چائنا	۱	۲۶	ملیالم	۳	۴۴	سربین	۲
۹	برمی	۲	۲۷	پشتو	۱۴	۴۵	ہنگری	۲
۱۰	جاپانی	۳	۲۸	فرانسیسی	۲۲	۴۶	البانی	۱
۱۱	چینی	۵	۲۹	انگریزی	۲۶	۴۷	ارمنی	۴
۱۲	سواحلی	۴	۳۰	لاطینی	۱۵	۴۸	رومانی	۱
۱۳	فلپائنی	۱	۳۱	جرمنی	۱۶	۴۹	آسٹرین	۲
۱۴	ہوسی	۱	۳۲	اٹالین	۹	۵۰	بوہیمیا	۲
۱۵	حبشی	۱	۳۳	اسپینی	۶			
۱۶	مالٹی	۱	۳۴	ڈچ	۵		کل تراجم	۳۷۹
۱۷	تیلیگو	۳	۳۵	یونانی	۲		☆	

جناب اختر راہی۔ بی اے

مولانا لیاقت علی الہ آبادیؒ

وطن و ولادت | مولانا پرگنہ چہائل ضلع الہ آباد کے ایک دیہات مہگاؤں کے رہنے والے تھے۔ مہگاؤں الہ آباد سے دس میل مغرب کی جانب ٹرنک روڈ پر واقع ہے۔ مولانا کا یوم ولادت قطعی طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا البتہ قرائن سے عبدالباری عاصی ایم اے نے ۱۸۱۵ء تا ۱۸۲۰ء کے دوران میں ان کی ولادت بتائی ہے۔

تعلیم و تربیت | مولانا کے والد مہر علی کاشتکار تھے اور اسی پر گزر بسر تھی۔ البتہ ان کے بھائی دائم علی فوج میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے چچا دائم علی کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت جلد ہی اپنے علاقے میں درجہ امتیاز حاصل کر لیا

ملازمت اور وعظ و تذکرہ | غالباً چچا ہی کی صحبت و مشورہ سے فوج کی ملازمت کر لی۔ لیکن سال بھر سے زیادہ اس کافرانہ حکومت کے لئے سپاہیانہ خدمات انجام نہ دے سکے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ اثر تحریک مجاہدین کا ہی تھا، کیونکہ بعد میں مولوی صاحب تحریک مجاہدین کے سرگرم پروانے بن گئے تھے۔ اپنے وعظ و تقریر میں انگریزی حکومت پر نوک جھونک کر جاتے تھے۔ جیسا کہ مفتی شہابی لکھتے ہیں:

> "وعظ و تذکیر میں اقتدار نصاریٰ پر "تلمیحاً" اشارے کر جاتے تھے، اور اپنے مریدین کو جہاد کی ترغیب و تشویق کی تلقین کرتے تھے۔"

مولانا محض واعظِ خشک ہی نہ تھے، بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ سلسلہ قادریہ میں منسلک تھے، اور بیسیوں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔

مولانا سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے متاثر تھے اور کیوں نہ ہوں جبکہ اس مجاہدانہ تحریک نے آزادی کی لگن ہر دل میں پیدا کر دی تھی اور ہر گلی کوچے میں "جہادیہ" گایا جا رہا تھا۔ شاعروں نے منظوم جہاد نامے اور رجزیہ نظمیں لکھ کر اس تحریک کو عوامی بنا دیا تھا۔

مولانا لیاقت علی نے صرف "سخنے" ہی اس عظیم مقصد کے لئے کام نہ کیا بلکہ "درمے" اور "قدمے" بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ انہوں نے تحریک جہاد کی نشر و اشاعت کیلئے مولوی خرم علی بلہوری (م $\frac{۱۲۷۳ھ}{۱۸۵۷ء}$) کے جہاد نے کے پہلے ۲۷ اشعار کو شائع کرا کر تقسیم کیا اور ۲۴، ۲۵، اور ۲۶ ویں اشعار کو باقتضائے حالات بدل دیا۔ اس منظوم نشر و اشاعت کے علاوہ ایک منثور اعلان بھی چھپوایا۔

انگریزوں کی نگاہ میں | انگریز حکام نے مولانا کی شخصیت کو ایک "گمنام" عام شہری سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔ اولاً تو میلسن کے وقائع نگاروں کو مولانا کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ چلا، اور جب ایک افسر کی معرفت معلوم ہوا تو یہ لکھا کہ "غدر سے پہلے یہ ایک غیر معروف باشندے تھے۔" مسٹر ویلاک (WILLOCK) لکھتا ہے کہ مولانا لیاقت علی

> "ذات کے باف‍ندے تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا۔ انتہائی تقدس کے باعث انہوں نے اپنے گاؤں میں بڑی عزت و حرمت حاصل کر لی تھی۔ جب بغاوت کا آغاز ہوا تو پرگنہ چائل کے زمینداروں نے جو کسی بھی قائد کی پیروی کے لئے تیار تھے، اس شخص کو اپنا سردار چن لیا۔ اور شہر پر حملہ بول دیا۔ شاہ دہلی کیجانب سے اسی کو ضلع کا گورنر بنا دیا گیا۔"

ویلاک کے اس بیان میں تضاد نمایاں ہے۔ اگر وہ کوئی غیر معروف آدمی تھے تو انہیں عوام میں مقام محترم کیسے حاصل ہو گیا۔؟ اور اگر وہ محترم نہ تھے تو پھر زمینداروں کا اپنا سردار بنا لینا ہی کیا معنی رکھتا ہے۔؟

تنقید | مولانا کے والد کاشتکار تھے نہ کہ باف‍ندے اور اگر باف‍ندگی ہی ان کا پیشہ ہوتو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عزت و احترام تو صلاحیت اور قابلیت پر مبنی ہے نہ کہ کوئی پیشہ ذلیل یا محترم بناتا ہے۔ مولانا ایک خود دار حریت پسند تھے وہ بھلا انگریزوں سے کیسے راہ و رابطہ رکھتے

اور معروف بننے کے لئے کوشاں رہتے۔

انقلاب | ۹ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی میں سرکشی کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے ساتھ الہ آباد میں جہاد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ۵ر جون کو جہاد کا باقاعدہ اعلان ہوا اور ۶ر جون کو مولانا لیاقت علی الہ آباد پہنچے۔ اور قیادت سنبھال لی۔ خسرو باغ الہ آبادی کو مستقر بنایا گیا اور انقلابی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مولانا نے انتظامی امور کے لئے تھانیدار اور تحصیلدار مقرر کئے۔

میلی سن لکھتا ہے کہ "پیروانِ اسلام میں مولوی صاحب کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔"

عارضی حکومت | انقلابی حکومت کے قائم ہونے پر انگریز قلعہ میں محصور ہو گئے۔ مولانا کے ساتھی انگریزی توپوں کی زد سے باہر مظاہرے بھی کرتے رہتے۔ مفتی شہابی کے بیان کے مطابق مولانا کے مریدوں کے علاوہ رام چند نامی ہندو کی سرکردگی میں ہندوؤں کی ایک تعداد بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

مولانا نے پہلے جہادیہ منسوب بہ خرم علی بلہوری شائع کیا تھا، اب ایک نثر میں دعوتِ عام چھپوائی اور اسے تقسیم کیا، عوام کو جہاد پر اکسایا، کنہیا لال نے اس اعلان کا پورا متن درج کیا ہے۔ مولانا نے اس اعلان میں انگریزی مظالم کو ایک ایک کر کے گنایا اور اسلامی نقطۂ نظر سے جہاد کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

چنانچہ اس اشتہار اور اعلانِ عام کے بعد ۱۶ر جون کو انگریزوں اور مجاہدین میں مقابلہ ہوا اور بدقسمتی سے انگریزوں کا پلڑا بھاری رہا اور الہ آباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ مولانا الہ آباد سے نکل کر نانا راؤ کے پاس کانپور چلے گئے۔ نانا راؤ نے جو فتح پور کی مہم پر بھیجا۔ اس مہم میں بروایت میلی سن "الہ آباد کا مولوی" بھی شامل تھا۔ کانپور میں مولانا نے بخشی زین العابدین کے مکان پر قیام کیا تھا۔

جون ۱۸۵۸ء میں مولانا پھر احمد اللہ شاہ کے ساتھ سرگرم کارزار دکھائی دیتے ہیں۔

احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد مولانا لیاقت علی گجرات آ گئے۔

مولوی لیاقت علی ایک سال بڑودہ میں رہے پھر لاجپور میں قیام کیا۔ ہر جگہ اپنی خلوص ہمت اور عقلمندی کی بنا پر سب متعلق رہے۔ لاجپور کے قیام کے دوران میں مولانا نے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ مولانا کے اصلاحی جذبے میں بالکل کمی واقع نہ ہوئی، بلکہ پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھاتے رہے۔ کئی قبیح رسوم کو ختم کیا اور "فرقہ جہادیہ" کے نام سے لوگوں کی بیعت حاصل کرتے تھے۔

۱۸۶۵ء میں ابراہیم محمد یاقوت خان تخت نشین ہوئے۔ ریاست میں تمام مقدمات شریعت

اسلامی کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔ مولانا لیاقت علی اور صوفی عبدالاحد لاچپوری یہ فرائض انجام دیتے تھے۔

یہیں مولانا نے ٹونک یا جے پور کے ایک عالم کی صاحبزادی سے شادی کر لی جن سے ایک لڑکی امت اللہ نامی پیدا ہوئی، دس سال تک مولانا لاچپور میں مقیم رہے۔ آخر انگریزی حکومت کو ان کے بارے میں اطلاع مل گئی۔ مولانا ٹوہ پاکر لاچپور سے بمبئی چلے گئے اور یہیں گرفتار ہو گئے۔

عام طور پہ یہ روایت مشہور ہے کہ مولانا الہ آباد سے شکست کھانے کے بعد دہلی آئے تھے اور بادشاہ سے فوجی امداد طلب کی تھی لیکن بخت خان کے ساتھ لکھنؤ کا پروانہ ولایت لے کر لکھنؤ چلے گئے۔ مفتی شہابی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے الہ آباد گئے اور پھر لکھنؤ۔ لیکن یہ دونوں روایات درست نہیں۔ لکھنؤ کا پروانۂ ولایت کیسے مل سکتا ہے۔ جبکہ وہاں برجیس قدر تخت نشین ہو چکا تھا۔ اور ہاں ان کے پاس کوئی سپاہ بھی نہیں اور واپس بھلا الہ آباد جانے میں کیا رمز ہے؟ پھر مزید کڑی جوڑی جاتی ہے کہ وہ اودھ سے نیپال چلے گئے۔ انگریزی حکومت نے نیپال کے راجے کو مفرور واپس کرنے کو کہا تو حکومت نیپال نے چند افراد کے علاوہ سب کو واپس بھیج دیا۔ ان ہی میں مولانا لیاقت علی بھی تھے۔ چنانچہ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج		تا ثریا مے رود دیوار کج

عبدالباری عاصی ہی کا بیان درست معلوم ہوتا ہے۔

مولانا لیاقت علی گرفتار ہوئے اور مقدمۂ بغاوت چلا۔ مقدمہ کیا تھا۔ انگریزوں نے اپنے انتقام کی خاطر دو چار پیشیوں کے بعد سزا بعبور دریائے شور کا حکم سنا دیا۔ ۱۸۶۹ء میں انڈیمان پہنچے تقریباً ۲۳ سال تک انڈیمان میں اسیری کی زندگی بسر کر کے ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری نے انڈیمان سے روانگی پر جو دعوت اپنے دوستوں کو دی ان میں مولانا لیاقت علی الہ آبادی کا خاص طور پہ ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اسارت میں بھی اپنے ہم مسلک مجاہدین سے کس قدر انس تھا۔ ■■

ادبیات

ابوالصفاء رضوانی افغانی مرحوم

ترجمہ : مولانا لطافت الرحمان صاحب استاذ اعلیٰ
جامعہ اسلامیہ بہاولپور

قصیدۃ الرضوانی فی بنی افغانی

افغان قوم کے بارہ میں قومی عصبیت کا غماز ایک قصیدہ

★

میری اور حضرۃ الاستاذ المحترم جناب علامہ افغانی صاحب دونوں کی طرف سے زیارۃ الحرمین کے اس مقدس سفر پہ تہنیت قبول کیجئے۔ میں نے جب آپ کے سفر حجاز کی خبر پڑھی تھی تو خیال ہوا تھا کہ واپسی پر ایک عربی قصیدہ مرتب کر کے آپ کو ارسال کروں گا، لیکن شدید تر مصروفیات نے اس خیال کو خیال ہی تک محدود رکھا، صرف اس قدر ہے کہ ۔۔

هنيئاً لكم يامن له المجد والعلى	بان زرتم بيت الاله المعظم
وزرتم مزار الحق والرشد والهدى	حبيب النبي الهاشمي المكرم
فيا ليتني رافقتكم في طوافكم	واحرامكم والرمي والسعي والدم

بہر صورت اس مختصر خیر مقدم کو الحق کے قریبی شمارہ میں اس ترجمہ شدہ عربی قصیدہ کے ہمراہ شائع فرمائیں ۔

اس قصیدے کا ذکر میں نے آپ سے مورخہ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر کیا تھا۔ ابو الصفاء رضوانی افغانی مرحوم کا یہ قصیدہ جو ان کی ایک کتاب شرح القصیدتین (قصیدہ مثلثیہ و قصیدہ مشفریہ) کے آخر میں چھپا ہوا ملا تھا، وہ کتاب ہمارے گھر کے کتب خانہ میں تھی جب نظر پڑی تھی تو اپنی کسی تصنیف میں یا مستقل طور پر شائع کرنے کا خیال ہوتا تھا، چنانچہ اس

بقرہ عید کی تعطیلات میں اسکو گھر سے لاکر ترجمہ کر دیا۔

قصیدہ افغان قوم کے بارہ میں کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم کی بعض خوبیاں نہ یہ کہ ناقابل فراموش ہیں بلکہ مستوجب تحسین وستائش بھی ہیں۔ جزاک اللہ آپ نے ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ کے نقش آغاز میں اپنے عمدہ انداز سے پختون قوم کی غیرت و حمیت اور اسکی اسلامی اور علاقائی روایات کی بابت خوب لکھا ہے۔ خیر ہمیں مقصود تو قصیدہ کی عربی چاشنی سے خود اور الحق کے قارئین کو لطف اندوز کرانا ہے، لیکن اگر ساتھ ہی اس غیور قوم کی بلند روایات اور قومی مناقب بھی سامنے آجائیں تو کیا ہرج ہے۔ پھر چونکہ قصیدہ کی معیاریت اور ادبیت کے تحت الحق ہی اسکی اشاعت کا حق رکھتا تھا، اس وجہ سے ارسال خدمت ہوا"۔

لطافت الرحمان

★

افغان قومٌ تراهم ان لقيت بهم اُسْدَ الشرىٰ وبني جنٍّ لدى الباس

افغان ایک ایسی قوم ہے جن سے اگر (میدان کارزار میں) تمہارا سابقہ پڑ گیا تو تم ان کو جنگل کے شیر اور جنات کی اولاد سمجھنے لگو گے۔

هينون لينون لكن في منازلهم وقلبهم بين حومات الوغى قاس

وہ اپنے گھروں میں بہت خاکسار اور نرم مزاج ہیں البتہ لڑائی کے میدان میں ان کے دل بہت سخت ہیں۔

ياجوجُ ماجوجُ ملأ الارض ليس لهم سدٌّ و واحد هم الفٌ بمقياس

وہ یاجوج ماجوج کی طرح ہیں تمام روئے زمین پر ان کے حملے کو روکنے والا کوئی نہیں ہے اور ان میں سے ایک آدمی سینکڑوں کے برابر ہے۔

طاروا الى الشرك لتشيطن في زجلهم ولو تكونن في اكناف مدراس

وہ لڑائی کی طرف زبردست جوش وخروش میں چل پڑتے ہیں، چاہے وہ بہت ہی دور مدراس کی طرف میں کیوں برپا نہ ہوئی ہو۔

لا تصطلی لہم نارٌ ولا احدٌ	یوم الرھان یساوی یمھم افراسٖ

مہمانوں کی خاطر ان کی آگ بجھتی نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی شخص گھوڑ دوڑ کے دن ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

لم یسمعوا غیر رنّات السیوف ولا	تشاغلوا عن دم الاعداء بالکاسٖ

انہوں نے تلوار کی جھنکار کے علاوہ کوئی آواز نہیں سنی ہے اور نہ شراب کے بھرے گلاسوں نے انکو دشمن کے خون بہانے سے غافل کر دیا ہے۔

قد حلّقت عافیات الطیر فوقہم	مصاحبات لہم فی غزو انجاسٖ

ان کے ناپاک دشمنوں سے لڑائی کے دوران مردار خوار پرندے اُن کے اوپر فضائیں حلقہ بنائے ہوئے ان کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔

للہ در رجال من خیابرۃٍ	ومن عفاریت للخناس سُوّاسٖ

خدا کی طرف سے بھلا ہو ان بہادروں کا جو درہ خیبر میں رہتے ہیں اور شیطانِ خناس کے مقابلہ کیلئے بہت باتدبیر اور بمنزلہ دیو کے ہیں۔

ویا لہم من بیوت فی بونیر وفی	سواد وعقابین بجیلاسٖ

ان کے ان شیر ببر اور عقاب و شاہین کی طرح بہادر لوگ قابلِ تعجب ہیں جو بونیر، سوات، چلاس میں رہتے ہیں۔

اللہ اکبر آجالٌ مقدّرۃٌ	بدت لاعداءھم فی صورۃ الناسٖ

خدا کی قسم یہ افغان قوم اپنے دشمن کے لئے اجل مقرر کی مانند ہے جو انسانوں کی شکل میں ظاہر ہو گئی ہے۔

یا شتّ غاراتہم فی کلّ ناحیۃٍ	من اصفہان الی اصقاع رھتاسٖ

اصفہان سے لیکر رہتک تک ملک کے تمام اطراف میں ان کا لوٹ مار اور قتل و غارت موجب حیرت ہیں۔

ھم دوّخوا ارض جیبال وحزنتہ	ولا کدقّک حبّات بمھراسٖ

انہوں نے پہاڑ کی سخت اور نرم زمین کو اُس سے بھی زیادہ روند ڈالا ہے، جیسا کہ تم دانوں کو کھرل میں ہتھوڑے سے کوٹتے ہو۔

کم من غیاض بھند قد خلت لھم	من کل فیل و مرمیس و نسناس

سرزمینِ ہند کے بیشمار جنگل انکے حملوں کی وجہ سے ہاتھیوں، گینڈوں اور بندروں سے خالی ہو گئے ہیں۔

فلا یقوم لھم قرن بملحمۃ	مثل الشیاہ اذا حست بجساس

میدانِ جنگ میں ان کا مقابل اسطرح بھاگ جاتا ہے جیسا کہ بکری بھیڑیئے کی آمد کا علم ہو جانے سے بھاگتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

فتیان صدق مساعیر الحروب وقد	فازوا من المجد والعلیا بالراس

اس قوم کے افراد نہایت بہادر نوجوان اور غایت درجہ جنگجو ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مجد و رفعت کے مراتب عالیہ پر فائز ہیں۔

بناۃ مجد اولو عز و ذو شرف	مؤسس فوق طود شامخ راس

وہ گھر یا مجد و بزرگی کی اولاد ہیں، اور ایسی عزت و شرافت والے ہیں، جسکی بنیاد ایک اونچا مستحکم پہاڑ ہے۔

توارثوا کابرا عن کابر شرفا	وصارما وسنانا مثل نبراس

انہوں نے اپنے بڑوں سے مسلسل طور پر شرافت، تیز تلوار، اور چمکتا ہوا نیزہ بطور میراث حاصل کر رکھے ہیں۔

بنی سلیمان من دان الالہ لہ	جنا و انسا و طیرا کل اجناس

وہ حضرت سلیمان کی اولاد ہیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنات، انسان اور ہر قسم کے پرند تابع اور مسخر کر دیئے تھے۔

بیض الانوق لدیھم بید دورھم	اوکار عقبان لبنان بعرناس

ان کے یہاں سفید اونٹنیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان کے گھر جبل لبنان میں رہنے والے عقابوں کے ان گھونسلوں کی طرح ہوتے ہیں جو پہاڑ کی چوٹی پر ہوں۔

ماضون فیما ارادوا کالصوارم او	کصائب السھم فی اقصاء برجاس

تیز و تند تلواروں کی مانند اور نشان پر لگنے والے تیر کی طرح وہ اپنے ارادوں کو پورا کرنے والے ہیں، اگرچہ دور دراز مقامات پر ہوں۔

لہ پورا قصیدہ شاعرانہ جذبات، اور عصبیتِ قومی کا آئینہ دار ہے۔ شاعرانہ مبالغہ آرائیوں کی طرح یہ بات بھی کوئی استنادی حیثیت نہیں رکھتی۔ (سمیع الحق)

بیض یصونون اعراضاً بانفسهم عن کل عار و اوساخ و ادناس

وہ لوگ اخلاقی دناءت سے پاک ہیں، اور خود ہی ہر قسم کی عار اور میل کچیل سے اپنی آبرو محفوظ رکھتے ہیں۔

ان قیل جودٌ فلا الطائی شابهم او وقعة فاتقاهم کل جساس

اگر جود و سخاوت کی بات ہو رہی ہو تو حاتم طائی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ اور اگر حادثہ اور واقعہ ہو تو ان کے حملے سے جاسوس بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کم انلفوا مالهم لله درهم جودا فلیسوا بابرام وانکاس

اللہ ان کا بھلا کرے وہ جو جود و سخا میں اپنا بہت مال خرچ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ نہ کنجوس ہوتے ہیں اور نہ کمزور۔

ما اکرم الضیف والجیران عندهم والمستجیر ولو کان ابن کناس

ان کے یہاں مہمان، پڑوسی اور پناہ حاصل کرنے والے بڑے آرام و عزّت سے رہا کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ خاکروب کی اولاد ہی کیوں نہ ہوں۔

لکل طارق لیلٍ فی الشتاء لهم نار یکب الیها راس شماس

رات کے وقت برآنے والے مہمان کیلئے سردیوں کے موسم میں ان کے یہاں آگ جلائی جاتی ہے جس کے زیر نظر مغرور شخص بھی سرنگوں ہو جاتا ہے۔

اغناهم طیب اخلاقٍ معطرةٍ عن اذفر المسک والریحان والآس

اس قوم کے بلند اخلاق کی عمدگی نے مشک اور ریحان و آس کی خوشبو سے ان کو بے پرواہ کر دیا ہے۔

اذا اجاروا عن بیاقال قائلهم نعوذ بالله من وسواس خناس

جب یہ لوگ مسافر کو پناہ دیتے ہیں تو ان کا کہنے والا کہتا ہے کہ ہم شیطان خناس کے وسوسہ میں واقع ہو جانے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

الفاعلین لما قالوا وما وعدوا به فلیس بهم ساهٍ ولا ناس

یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں یا کام کا وعدہ کرتے ہیں، تو اسکو پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ ان میں سہو و نسیان والا نہیں ہوتا ہے۔

ما غادروا لعدٍ یوم ما عاهدوا ابداً حتیٰ یلاموا بهذا ضربة الفاس

جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو ہمیشہ اس کے پابند رہتے ہیں بلکہ وعدہ توڑنے سے کسی کو ملامت کرنا اسکو کلہاڑی سے مار دینے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

کم فیہم والحماسین من عرب اذا وزنتہما وزنا بقسطاس

اگر اندازہ کیا جائے تو اس قوم میں اور عرب قوم کے بہادروں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔

ما اجہل الجاہلین الذین مضوا من کل راع وجمال الی فاسی

نہ معلوم کس بات نے گذشتہ لوگوں کو جاہل بنایا تھا جو کہ چرواہے، شتربان اور مکار ہوا کرتے تھے۔

تفاخروا بہوا قلما حصلت لہم کعنا رب اخماس باسداس

وہ جاہل لوگ مکار اور دھوکا بازوں کی طرح ایسی باتوں پر فخر کرتے تھے جو ان کو میسر نہیں ہوتی تھیں۔

ان بالغ الشعراء العرب عن طمع ایا الصفاء فانت الطاعم الکاسی

اے ابو الصفاء! اگر عرب شعراء طمع و لالچ کے تحت مبالغہ آمیزی کرتے تھے (تو بھی) تم تو اوروں کو کھلانے اور پہنانے والے ہو۔

بقیہ: حدیث کا معیار

اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ صحیحین یا کتب خمسہ سے جو احادیث صحیحہ رہ گئی ہیں وہ کم ہی ہیں۔ تو تب بھی ابن صلاح کا موقف اس سے مبرہن نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان کم احادیث کو بھی تو ایسے ہی چھوڑ دینا یا ایسے لینا مناسب نہیں۔ ان کو بھی جانچا پرکھا جائے گا، اور وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ متاخرین کو تصحیح و تضعیف کا حق ہو، اور معیار تصحیح رجال حدیث اور اصول نقد ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ہمارے متاخرین محدثین کو تصحیح و تضعیف کے مجاز ٹھہرانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ہر کس و ناکس کو تصحیح و تضعیف کا حق دے رہے ہیں اور ہر کہ و مہ کو اس کا مجاز سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ متاخرین محدثین میں سے جن کے اندر وہ تمام شروط پائی جائیں جو ایک معدل و جارح میں ہونی چاہئیں اور جو اصول نقد وغیرہ سے پوری طرح واقف ہوں وہ اس کے مجاز ہیں کہ ان قواعد و ضوابط اور اصول نقد کی روشنی میں تصحیح و تضعیف کریں۔ ان شروط اور ان اصول نقد پر بحث کرنے کیلئے بھی مستقل ایک مقالہ کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ اس موضوع کو پھر کسی فرصت میں "معرفۃ اہلیت جرح و تعدیل" کے عنوان سے سپرد قلم کریں گے۔

جمہور محدثین حتیٰ کہ شیخ کے اپنے معاصرین کی مذکورہ بالا تصریحات دیکھنے کے بعد خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جمہور محدثین اور شیخ کے معاصرین کا بھی یہی مذہب ہے کہ متاخرین کو مشروط تصحیح حدیث کا حق حاصل ہے تو شیخ نے ان سب کے خلاف یہ قول کیوں اختیار کیا کہ "متاخرین کو اس کا حق نہیں" آخر اس کا سبب کیا ہے۔ تو اس بارے میں حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ ہماری رہنمائی ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

ان الحامل لابن الصلاح على ذالك	شیخ ابن صلاح کو اس دعویٰ پر امادہ کرنے والی چیز
ان المستدرك للحاكم كتاب كبير جدًا	یہ ہے کہ مستدرک حاکم بہت ضخیم کتاب ہے۔
يصفوا له منه صحيح كثير ومع حرصه	اس کا بیشتر حصہ (نقد وجرح سے) پاک وصاف
على جمع الصحيح غزير الحفظ۔ كثير الاطلاع	(صحیح) ہے۔ وہ چھانٹ چھانٹ کر صحیح حدیثوں
واسع الرواية فيبعد كل البعد ان	کو جمع کرنے کی حرص کے علاوہ پختہ حافظہ وسیع
يوجد حديث بشرائط الصحة لم	معلومات اور کثرت روایت کے ساتھ بھی موصوف
يخرجه۔	ہیں۔ ایسی صورت میں اس کا امکان بہت ہی کم ہے

کہ کسی حدیث میں شرائط صحت موجود ہوں اور حاکم نے مستدرک میں اسکی تخریج نہ کی ہو۔

یعنی ابن صلاح نے مستدرک حاکم کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کر لیا کہ اس میں تمام صحیح حدیثیں آچکی ہیں جب

صحیح احادیث کا تمام ذخیرہ اس میں آگیا ہے اور کوئی حدیث ایسی نہیں رہ گئی کہ جس میں شرائط صحت کی موجودگی کی وجہ سے اس پہ صحت کا حکم لگایا جاسکے۔ (کیونکہ ایسی ہر حدیث کی تو حاکم نے تخریج کر دی ہے۔) تو اب متاخرین کو تصحیح و تضعیف حدیث سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اب اگر وہ تصحیح و تضعیف کریں گے بھی تو کس حدیث کی ؟ سب احادیث کی تصحیح و تضعیف تو کرنے والے کر گئے ہیں۔ رہی سہی کسر حاکم نے پوری کر دی ہے۔ اس بنا پر شیخ ابن صلاح نے یہ دعویٰ کیا کہ "متاخرین کو تصحیح و تضعیف کا حق نہیں ہے"

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابن صلاح کا مستدرک حاکم پہ تکیہ لگانا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ علماء حدیث کا تقریباً اس پہ اجماع ہے کہ حاکم نے جو جو شرطیں اپنی مستدرک میں حدیث تخریج کرنے کی لگائی تھیں وہ ان پر قائم نہیں رہ سکے۔ اور ان سے تخریج احادیث میں بہت تساہل ہوا ہے حتیٰ کہ مستدرک میں بعض ضعیف اور منکر احادیث تک کی بھی تخریج کر دی ہے۔ چنانچہ ابو سعید المالینی تو یہاں تک فرما گئے ہیں کہ :

طالعت المستدرک من اولہ الی آخرہ — میں نے مستدرک (حاکم) کا از اول تا آخر مطالعہ

فلم اجد حدیثاً علی شرط البخاری و مسلم — کیا مجھے ایک حدیث بھی ایسی نہ ملی جو بخاری و مسلم کی شرط پہ ہو۔

الفصاح صـ۲۲

یہاں ابو سعید مالینی نے کس قدر مبالغہ سے کام لیا ہے۔ یہ کہنا تو صحیح ہے کہ مستدرک میں بعض احادیث بخاری و مسلم کی شروط پہ پوری نہیں اترتیں۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس میں من اولہ الی آخرہ کوئی ایک حدیث بھی بخاری و مسلم یا فقط بخاری یا فقط مسلم کی شرط پہ نہیں۔ کیونکہ نصف کتاب تقریباً ایسی ہے کہ اس میں جو احادیث ہیں وہ ان شروط پہ پوری اترتی ہیں کہ جنکا حاکم نے التزام کیا تھا۔ اسیطرح حافظ ذہبی نے ایک "جزء" لکھا اس میں وہ موضوع احادیث جمع کیں جو حاکم کی مستدرک میں آگئی تھیں۔ ایسے ہی ذہبی نے مستدرک کی تلخیص بھی کی اور اس میں بھی بہت سی احادیث کا تعاقب کیا اور بہت سی احادیث ضعیفہ کو جو کہ مستدرک میں آگئی تھیں جمع کیا۔ خود ابن صلاح کو حاکم کے تساہل کا اعتراف ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ ابن صلاح صـ۱۱ —— تو جب مستدرک حاکم میں ضعیف اور منکر بلکہ موضوع تک احادیث ہیں تو پھر اس پر تکیہ کیسے لگایا جاسکتا ہے۔

حاکم کے تساہل کی حقیقت اب یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر حاکم جیسے پختہ حافظ اور وسیع معلومات رکھنے والے شخص سے یہ تساہل کیسے ہوگیا ؟ تو اسکی وجہ علماء حدیث نے

یہ بتلائی ہے کہ حاکم نے پہلے مستدرک (بطور مواد کو اکٹھا کرنے کے) جمع کیا، اس میں ہر قسم کی احادیث آگئی تھیں۔ پھر انہوں نے اس پر نظر ثانی شروع کی، اور جو جو احادیث اپنی ملتزمہ شروط پر پوری نہیں اترتی تھیں ان کو خارج کرتے گئے۔ ابھی کتاب کے چھ اجزاء میں سے صرف ڈیڑھ جزء پر ہی نظر ثانی ہوئی تھی کہ زندگی نے وفا نہ کی اور اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور باقی کتاب بغیر تنقیح کے رہ گئی۔ اور جہاں تک تنقیح ہوئی وہاں یہ بھی مرقوم ہے کہ "تم املاء الحاکم" المصباح ص۴۳ کہ یہاں تک حاکم کی املا (تنقیح) تمام ہوئی۔

بہرحال سبب تساہل کچھ بھی ہو، اتنی بات تو یقینی ہے کہ تساہل ہوا ہے۔ اور اس میں تمام احادیث صحیحہ نہیں آسکتی ہیں۔ لہذا اس پر اعتماد کرکے متاخرین کو تصحیح و تضعیف حدیث کے حق سے محروم کرنا معتبر نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ حاکم سے تساہل نہیں ہوا ہے اور مستدرک میں ایک حدیث بھی ضعیف، منکر اور موضوع نہیں ہے، بلکہ تمام صحاح ہی ہیں تو تب بھی مستدرک حاکم کو حرف آخر سمجھنا درست نہ ہوتا۔ کیونکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ

"من قال ان السنۃ کلھا اجتمعت عند رجل واحد فسق۔ ومن قال ان شیئا منھا فات الامۃ فسق۔	جس نے یہ کہا کہ ساری سنت نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کسی ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی ہے۔ اس نے (بھی) غلط بات کہی اور جس نے یہ کہا کہ سنت نبویہ کا کوئی گوشہ پوری امت محمدیہ سے چھوٹ گیا ہے اس نے بھی غلط کہا۔
توضیح الافکار ص۵۵ ج۱	

...

یعنی نہ تو کوئی ایک شخص ساری کی ساری سنت کو اکیلا جمع کر سکا اور نہ ہی پوری امت مسلمہ سنت نبویہ میں سے کوئی چیز چھوڑ سکی۔ بلکہ پوری امت نے مل کر تمام احادیث کو محفوظ اور جمع کیا ہے۔ بعض ایک شخص کے احادیث کو جمع کرنے سے تمام حدیثیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب ایک شخص تمام ذخیرہ حدیث کو جمع نہیں کر سکتا تو پھر کسی ایک شخص کی تصحیح و تضعیف اور تصنیف و تالیف کو کیسے حرف آخر سمجھا جا سکتا ہے۔ لہذا حاکم سے تساہل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اسکی مستدرک پر اس قسم کا تکیہ لگانا درست نہیں جس قسم کا شیخ ابن صلاح نے لگایا ہے اور اسکو اپنے دعویٰ کا سبب بنایا ہے۔

ایک قابل غور امر یہ تو تھا ابن صلاح کی عبارت کا وہ مطلب جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے اور سمجھا گیا ہے۔ لیکن بہت ہی ناانصافی ہوگی اگر ہم شیخ کی عبارت سے صرف نظر کریں اور

ان کی عبارت کی وضاحت نہ کریں۔ اس لئے اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے شیخ ابن صلاح کی عبارت پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ کیا ابن صلاح کی عبارت کا وہی مطلب ہے جو عام طور پر سمجھا گیا ہے ــــــ کہ وہ متاخرین کو تصحیح حدیث کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ــ یا کچھ اور ہے۔؟ تو اس کے بارے میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شیخ ابن صلاح کی عبارت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ابن صلاح اس کے قائل نہیں ہیں کہ "متاخرین تصحیح وتضعیف حدیث کے قطعاً مجاز نہیں ہیں" بلکہ ان کی عبارت سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ "ہم ایسے کام کو سرانجام دینے کی جرأت نہیں کرتے کہ جس کو متقدمین نے نہیں کیا" یعنی جس حدیث کو انہوں نے ضعیف نہیں کہا یا صحیح نہیں کہا، ہم اسکو ضعیف یا صحیح کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر متاخرین اس کام کو سرانجام دینے کی اگر جرأت کریں تو وہ اس کے مجاز بھی ہیں یا نہیں۔؟ تو اس کے بیان سے ابن صلاح کی عبارت بالکل ساکت ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ فرماتے ہیں:

"اذا وجدنا حديثا صحيح الاسناد لم ينص على صحته) فانا لا نتجاسر على جزم الحكم بصحته" ...	جب ہم کوئی صحیح الاسناد حدیث پائیں کہ جکی صحت پر متقدمین میں سے کسی کی تصریح موجود نہ ہو تو ایسی حدیث پر قطعی طور سے صحت کا حکم لگانے کی جرأت نہیں کرتے، اور نہ کریں گے۔

اگر جرأت کرلی تو وہ معتبر ہوگی یا نہیں؟ تو اس کا کوئی ذکر اس عبارت میں نہیں ہے۔ لہذا ہمارے نزدیک ابن صلاح کی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ "وہ متاخرین کو تصحیح حدیث کا حق دینے کیلئے تیار نہیں یا یہ کہ وہ تصحیح حدیث کے دروازے کو بند کرنا چاہتے ہیں۔" درست نہیں۔

مگر چونکہ ابن الصلاح کی عبارت سے عموماً یہی مطلب اخذ کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتانے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اگر واقعی حافظ ابن صلاح کا یہی مقصد ہے کہ "متاخرین تصحیح حدیث کے مجاز نہیں" تو یہ کہاں تک صحیح اور قابل اتباع ہے۔؟

شیخ کے ادلہ کی حقیقت | تو اس بارے میں ہم عرض کریں گے کہ اگر واقعی شیخ ابن صلاح کا یہی موقف ہے کہ "متاخرین تصحیح حدیث کے مجاز ہی نہیں" تو یہ کئی وجوہ سے مرجوح ہے۔

اولاً تو اس لئے مرجوح ہے کہ یہ موقف (جیساکہ پہلے اشارۃً معلوم ہوا) جمہور محدثین کے مذہب کے خلاف ہے۔ متاخرین میں اور خود شیخ کے معاصرین میں بہت سے حضرات ایسے ملتے

ہیں کہ جنہوں نے ایسی ایسی احادیث کی تصحیح و تضعیف کی ہے کہ جنکی تصحیح و تضعیف پر نہ تو متقدمین کی تصریح موجود تھی اور نہ ہی وہ کتب خمسہ میں سے کسی کتاب میں درج کی گئی تھیں۔ لیکن ان میں صحیح و ضعیف کی شرائط ضرور پائی جاتی تھیں۔ اور امت نے ان کی تصحیح و تضعیف کو قبول بھی کیا۔ جیسے کہ ابن القطان۔ ضیاء۔ مقدسی۔ ابن المواق، دمیاطی، مزی، تقی السبکی وغیرہم، لہذا جمہور کے مقابلہ میں شیخ کا موقف لامحالہ مرجوح ہوگا۔

ثانیاً اس لئے بھی شیخ کا موقف قابل ترجیح نہیں کہ شیخ کا رجال سند اور اصول نقد کو نظرانداز کرکے مدار صحت کتب کو ٹھہرانا اور تعارض کے مواقع میں انہی کتابوں کی حدیثوں کو قابل ترجیح قرار دینا صرف مذہب جمہور کے ہی خلاف نہیں مسلمہ اصول روایت و درایت کے بھی خلاف ہے۔

ثالثاً اس لئے یہ موقف کسی قوی دلیل پر مبنی نہیں کہ بقول شیخ کمال الدین ابن ہمام کے اصول نقد اور رجال سند کو نظرانداز کرکے مدار صحت فقط صحیحین کو ٹھہرانا اور معیار صحت فقط کتب کو قرار دینا تحکم محض ہے۔ چنانچہ شیخ ابن ہمام فرماتے ہیں:

من قال اصح الاحادیث مافی الصحیحین ثم ما اشتمل علی شرط احدھما تحکم لایجوز التقلید فیہ۔ اذالاصحیۃ لیست الا لاشتمال رواۃ حدیث علی الشروط التی اعتبراھا۔ فاذا وجدت تلک الشروط فی رواۃ حدیث فی غیر الکتابین افلایکون الحکم باصحیۃ مافی الکتابین عین التحکم۔؟	جو شخص یہ کہتا ہے کہ "احادیث میں سے سب سے زیادہ صحیح حدیث وہ ہے جو صحیحین (بخاری مسلم) میں ہے۔ پھر وہ جو ان میں سے کسی ایک (یا دونوں) کی شرط پر ہے"؟ یہ زبردستی کی بات ہے۔ اس میں اسکی تقلید جائز نہیں۔ اس لئے کہ اصحیت کا مدار (صحیحین پر ہونے کی بجائے) رواۃ حدیث میں ان شروط کے پائے جانے پر ہے کہ جن کا اعتبار بخاری و مسلم نے (بھی) کیا ہے۔ اگر وہی شروط بخاری و مسلم کے علاوہ کسی دوسری حدیث کے رواۃ میں پائی جائیں تو کیا (اب بھی) صحیحین کی احادیث پر ہی اصحیت کا حکم لگائے جانا زبردستی کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔؟ (اس لئے کہ وہی شروط بخاری و مسلم کے رواۃ میں ہیں اور وہی انکے علاوہ دوسری حدیث کے رواۃ میں۔؟)

فتح القدیر ص ۳۱۷، ۳۱۸ ج ۱ باب النوافل

معلوم ہوگیا کہ مدار اصحیت کتب نہیں ہیں۔ بلکہ وہ شروط ہیں جنکا بخاری و مسلم نے بھی اعتبار کیا ہے۔ لہذا جب وہ شروط صحیحین کے علاوہ کسی دوسری حدیث میں پائی جائیں گی تو وہ بھی اصح ہوگی۔

اگرچہ بخاری ومسلم نے اسکی تخریج نہ کی ہو۔ اب جبکہ مدار اصحیت شروط ہوئیں تو اب ممکن ہے کہ متقدمین میں سے کسی نے کسی حدیث کی تصحیح یا تضعیف کی ہو اور اس سے اس میں ذهول ہو گیا ہو یا وہ کسی علت قادحہ یا کسی وصف پر مطلع نہ ہوا ہو اور متاخرین میں سے کسی نے اس پر اطلاع پائی ہو لہذا اسکو حق حاصل ہوگا کہ وہ اصول نقد کے پیش نظر تصحیح و تضعیف کرے۔

یہی رائے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے وہ بھی مدار اصحیت صحیحین کو ٹھہرانے کو تحکم کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "المنہج القویم فی شرح الصراط المستقیم" میں اس پر کافی وشافی بحث کی ہے۔ آخر میں خلاصے کے طور پر فرماتے ہیں :

حاصل ایں سخن آنست کہ اعتماد بر تصحیح و تنقید	اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین واکابر
ائمہ مجتہدین واکابر سلف است وچوں ایشاں	سلف کی تصحیح و تنقید پر اعتبار اور مدار ہے جب
حدیثے راتلقی بقبول کردہ وعمل بداں نمودہ	انہوں نے کسی حدیث کو قبول کر لیا اور قابل عمل قرار
انکار و اعتراض بر ایشاں بتقلید علماء محدثین	دیا تو مشہور علماء محدثین کی تقلید کر کے ان پر اعتراض
کر مشہور اند جائز نباشد۔ والتزام ایشاں	کرنا اور ان کی بات کو تسلیم نہ کرنا درست نہ ہوگا۔
بحکم ایں جماعۃ تحکم ومکابرہ است۔	اور اس جماعت فقہا کے حکم لگانے کے باوجود
"المنہج القویم صفحہ بحوالہ فوائد مجاز الشافعیہ صفحہ ۱۴"	محدثین کی بات کو لازمی سمجھنا اور یقینی کہنا زبردستی
	کی بات ہے۔

یعنی اگر محدثین نے کسی حدیث کی تصحیح یا تضعیف کردی ہے تو وہ حرف آخر نہیں ہے کہ اس کے خلاف کرنا ناجائز ہو، بلکہ اگر ان سے خلاف کرتے ہوئے فقہاء نے کسی حدیث کی تصحیح یا تضعیف کی اور قابل عمل یا ناقابل عمل قرار دیا تو محدثین کی تصحیح و تضعیف کو مدار بنا کر فقہاء پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ متاخرین بھی تصحیح و تضعیف کے مجاز ہیں۔ یہ حق صرف متقدمین کیلئے ہی خاص کر لینا تحکم (زبردستی کی بات) ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ | ہم نے جو یہ کہا ہے کہ "صحیحین یا دیگر کتب صحاح مدار اصحت نہیں بلکہ اصل اصحیت کا مدار۔ رجال سند اور اصول نقد ہیں" ممکن ہے اس سے کوئی کج فہم یہ سمجھے کہ ہم صحیحین کی احادیث کی تضعیف کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اس سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں، بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ صحیحین میں تمام صحاح احادیث درج نہیں کی گئی ہیں، جتنی احادیث صحیحین میں آئی ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ احادیث صحیحہ باقی رہ گئی ہیں۔

ہاں جو صحیحین میں آگئی ہیں وہ بلاشبہ صحیح ہیں۔ چنانچہ امام مسلمؒ خود فرماتے ہیں کہ :

لیس کل صحیح کتبتہ ھنا ولکن کتبت الاحادیث التی اجمع العلماء علی صحتہا۔	میں نے تمام احادیث صحیحہ کو اپنی کتاب مسلمؒ میں جمع کرنے کا التزام نہیں کیا۔ بلکہ صرف وہی احادیث صحیحہ جمع کی ہیں جن کی صحت پر علماء وقت نے اجماع کیا۔
مصباح صفحہ ۱۴۲ وتدریب صفحہ ۴۹	

تنبیہ | امام مسلم کے اس اجماع سے راجح قول کے مطابق، امام احمد بن حنبلؒ، ابن معینؒ، ابن ابی شیبۃؒ اور ابوسعید بن منصور کا اجماع ہے۔ لہذا امام مسلم پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

اس طرح شیخ عبدالحق بھی فرماتے ہیں کہ بخاری و مسلم میں تمام احادیث صحیحہ کا ذخیرہ نہیں آسکا۔

احادیث صحاح منحصر نیست در صحیح بخاری و مسلم۔ وایشاں استیعاب نہ کردہ اند جمیع صحاح راکہ نزد ایشاں بود بر شرط ایشاں چہ جائے مطلق صحیح وخود تصریح کردہ ہر یکے از ایشاں بعدم احاطہ و استیعاب۔	احادیث صحیحہ بخاری و مسلم میں منحصر نہیں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ان تمام احادیث صحیحہ کا جو ان کے پاس ان کی شرط کے مطابق موجود تھیں احاطہ نہیں کیا ہے۔ صحیح حدیثوں کا تو ذکر ہی کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک نے تو تمام صحاح کے احاطہ و استیعاب نہ کرنے کا صاف صاف اقرار کیا ہے۔
المنہج بحوالہ فوائد جامعہ صفحہ ۱۴۹	

الغرض علماء حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ بخاری و مسلم نے تمام صحاح احادیث کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ اور یہی ہمارا مقصد و مطلب ہے اس بات سے کہ "مدار اصحیت صحیحین یا دیگر کتب حدیث نہیں ہیں"۔ نہ یہ کہ ہم صحیحین کی احادیث کی تضعیف کرنا چاہتے ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ بخاری و مسلم نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ نہیں کیا تو پھر صحیحین و دیگر کتب کو مدار اصحیت کیسے بنایا جاسکے گا۔ پھر تو ان احادیث صحیحہ کا رد کردینا لازم آئیگا جو صحیح تو ہیں لیکن کتب خمسہ میں نہیں آسکیں (کما سیجیٔ انشاء اللہ) یہ تو بالکل صحیح ہے کہ جو احادیث صحیحین میں اصالۃً آگئی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں لیکن یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں کہ جو ان سے رہ گئی ہیں وہ غیر صحیح ہیں لہذا مدار اصحیت رواۃ حدیث میں انہی شروط کی موجودگی پر ہی ہوگا، جنکا اعتبار بخاریؒ و مسلمؒ نے بھی کیا ہے۔ پھر بہت ممکن ہے کہ کوئی ایسی حدیث بھی نکل آئے جو صحیحین کی احادیث

سے بھی زیادہ صحیح ہو۔ چنانچہ قاسم الاندجانی فرماتے ہیں:

فالاحادیث التی اوردھا غیرھما من الاحادیث الصحیحۃ نازلۃ درجتھا عن الاحادیث التی فی الصحیحین ولکنہ یمکن ان تکون الاحادیث التی اوردھا غیرھما متفوقۃ علی احادیث الصحیحین بقرائن تدل علیھا۔	جن احادیث صحیحہ کو بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے حضرات مصنفین نے ذکر کیا ہے (بیشک) وہ صحیحین کی احادیث سے درجہ میں کم ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جن احادیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے حضرات نے ذکر کیا ہے وہ صحیحین کی احادیث پر ایسے قرائن (علامات) کی وجہ سے مقدم ہوں جو اس تقدیم پر دلالت کرتے ہوں۔
المصباح ص ۳۹	

اور یہ اسی وقت ہو سکے گا جبکہ معیار صحت کتب کی بجائے رجالِ سند اور اصولِ نقد کو مانا جائے تو ہمارا مقصد صحیحین کو مدارِ صحت نہ ٹھہرانے سے انکی تضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ ان میں سب احادیث صحیحہ نہیں آئیں۔ اب جو باقی احادیث صحیحہ رہ گئی ہیں، ان کو پرکھنے کیلئے بھی کوئی کسوٹی ہونی چاہیئے اور وہ اصول نقد ہی ہیں نہ کہ کتب۔

رابعاً شیخ ابن صلاح کا موقف اس لئے مرجوح ہے کہ بقول حافظ ابن حجرؒ کے علامہ موصوف نے "صحیح" کی تعریف میں جو "حفظ" کی قید لگائی ہے، یہ جمہور محدثین کے مذہب کے خلاف ہے۔ "صحیح" کیلئے حفظ کی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ بعض متقدمین سے یہ مروی ہے لیکن قدیم و جدید زمانہ میں اسی پر عمل رہا ہے کہ حفظ کی شرط "صحیح حدیث" کیلئے نہیں ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ شیخ ابن صلاح خود اپنے مقدمہ میں آگے چل کر یعنی ص ۱۸۵ پر حفظ کی قید لگانے کو اہل تشدید کا مذہب کہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"ومن مذاھب التشدید مذھب من قال" لاحجۃ الا فیما رواہ الراوی من حفظہ وتذکرہ"	تشدید مذاہب میں سے (ایک) مذہب اس کا بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ روایت وہی قابل حجت ہے جسکو راوی اپنے حفظ اور یاد سے بیان کرے (نہ کہ کتاب سے)
مقدمہ ابن صلاح ص ۱۸۵، ۱۸۶	

جب شیخ کے نزدیک "صحیح" کی تعریف میں حفظ کی قید لگانا اہل تشدید کا مذہب ہے تو پھر خود ان کا یہ قید لگانا کیسے افراط و تفریط میں داخل نہ ہوگا۔

خامساً اس لئے ابن صلاح کا موقف قابل ترجیح نہیں کہ بقول حافظ ابن حجرؒ کے شیخ کا کتاب سے روایت بیان کرنے کو عیب اور حافظہ کی کمزوری کہنا اور سمجھنا درست نہیں۔ اس لئے کہ جب حفظ، صحیح کیلئے شرط ہی نہیں تو پھر حفظ کی بجائے کتاب سے روایت کرنا عیب کیسے ہوگا۔؟ اور پھر صحابہ و تابعین کے بعد اکثر رواۃ کا تو وصف ہی کتاب سے بیان کرنا ہے، لہذا کتاب سے روایت بیان کرنا کوئی عیب کی چیز نہیں کہ جسکی بنیاد پر شیخ ابن صلاح متاخرین کو تصحیح و تضعیف کا حق دینے کیلئے تیار نہیں۔

سادساً اس لئے بھی شیخ کا مؤقف مرجوح ہے کہ بقول حافظ ابن حجر کے شیخ کے کتب کو معیارِ تصحیح ٹھہرانے میں ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے صحیح حدیث کو رد کرنا اور غیر صحیح کو قبول کرنا لازم آتا ہے۔ اس طرح کہ بہت سی احادیث ایسی ملتی ہیں کہ متقدمین نے تو ان کی تصحیح کی ہے۔ لیکن متاخرین ان میں سے کسی حدیث میں علة قادحہ (مانع عن الصحت عیب) پر مطلع ہوئے اور انہوں نے اسکو اسکی وجہ سے غیر صحیح کہہ دیا، چنانچہ صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں کتنی حدیثیں ایسی ملتی ہیں جن پر انہوں نے تو صحت کا حکم لگایا ہے لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ وہ درجہ حسن سے زیادہ نہیں ہیں۔ اب اگر صحت کا مدار کتب یا متقدمین کی تصحیح پر ہو اور متاخرین کی بات لائق اعتبار نہ سمجھی جائے تو اس غیر صحیح حدیث کو قبول کرنا پڑیگا کہ جس میں علة قادحہ پر مطلع نہ ہونے کی وجہ سے متقدمین نے اسکی تصحیح کی تھی۔ تو غیر صحیح کو قبول کرنا لازم آگیا۔ اسی طرح بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحاح میں کل صحیح حدیثیں نہیں آئی ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ رہ گئی ہیں۔ اب جبکہ صحت کا مدار کتب ہوں گی ان تمام صحاح احادیث کو رد کرنا پڑیگا کہ جنکی تخریج کتب میں نہیں ہو سکی۔ اس نقصان سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ متاخرین میں سے اصول نقد سے پوری طرح واقفیت رکھنے والوں کو تصحیح و تضعیف کا حق دیا جائے۔

سابعاً ابن صلاح کا موقف اس لئے کمزور ہے کہ اس سے پھر ہم متقدمین کی تصحیح و تضعیف بھی قبول نہ کر سکیں گے۔ اس لئے کہ ابن صلاح کے نزدیک جب اسانید متاخرہ میں خلل واقع ہونے کی وجہ سے محض اسانید سے صحیح کا ادراک مشکل ہو گیا ہے کہ جسکی وجہ سے شیخ متقدمین کی تصحیح پر اعتماد کرنے پر مجبور ہیں تو متقدمین کی تصحیح و تضعیف بھی تو انہی اسانید متاخرہ کے واسطے سے ہم تک پہنچے گی، پھر اس کا قبول کرنا کیسے آسان ہو جائیگا۔؟ اگر اسانید متاخرہ سے صحیح کا ادراک مشکل ہے تو پھر انہی اسانید سے متقدمین کی تصحیح و تضعیف کو قبول کرنا بھی مشکل ہوگا، یا دونوں باتوں

کو قبول کرنا پڑیگا یا دونوں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انہی اسانید سے صحیح کا ادراک تو مشکل ہو لیکن متقدمین کی تصحیح و تضعیف کو قبول کرنا آسان ہو۔ تو شیخ کی عبارت میں ایک گونہ تعارض ہو گیا۔ لہذا ان کا یہ موقف راجح نہ ہو گا۔

ثامناً اس لئے شیخ کا موقف قابل قبول نہیں کہ شیخ کا محض اسانید متاخرہ کی وجہ سے صحیح کے ادراک کو متعذر و مشکل کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ بقول حافظ ابن حجرؒ کے۔ جو کتاب ایسی شہرت کی حامل ہو کہ اپنی شہرت کیوجہ سے اپنے مصنف تک اسانید کا اعتبار کرنے سے بے پرواہ کر دینے والی ہو وہ مصنف تک اپنی صحت کی نسبت کرنے میں رجال سند کے احوال کا اعتبار کرنے کی محتاج نہیں ہوتی۔ بس اس کتاب کا حوالہ دیدینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ لہذا اسانید متاخرہ سے صحیح کے ادراک کے مشکل ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تاسعاً اس لئے شیخ کی بات معتبر نہیں کہ شیخ خود اپنے مذہب پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ چنانچہ امر تصحیح کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

فالاولی ان نتوسط فی امرہ۔ فنقول ما حکم بصحتہ ولم نجد ذالک فیہ لغیرہ من الائمۃ ان لم یکن من قبیل الصحیح فھو من قبیل الحسن یحتج بہ ویعمل بہ الا ان تظھر فیہ علۃ توجب ضعفہ۔

مقدمہ ص۱۸

(حاکم کی تصحیح کے بارے میں بہتر یہ ہے کہ ہم درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے یہ کہیں کہ حاکم نے جس حدیث کی تصحیح کی ہے، اور وہ اس تصحیح میں منفرد ہیں وہ حدیث اگر صحیح نہیں تو حسن (تو ضرور) ہے، وہ قابل احتجاج بھی ہے اور قابل عمل بھی ہاں اگر کوئی علت رجب ضعف ظاہر ہو جائے (تو پھر وہ حسن بھی نہ رہیگی بلکہ ضعیف ہو جائیگی۔)

یہاں شیخ ابن صلاح کے قول "الا ان تظھر فیہ علۃ" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک حدیث میں کوئی متقدم کسی علۃ قادحہ پر مطلع نہیں ہو سکا، اور اس نے اس حدیث کی تصحیح یا تحسین کر دی لیکن متاخرین میں سے کوئی کسی علۃ پر مطلع ہوا جو ضعف کو مستلزم تھی اور اس نے اس حدیث کی تضعیف کر دی تو وہ حدیث متقدم کی تصحیح و تحسین پر قائم نہ رہے گی۔ بلکہ متاخر کی تضعیف کے بموجب ضعیف ہو جائیگی، اب اگر متاخرین کو تصحیح و تضعیف کا حق نہ تھا تو شیخ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ: الا ان تظھر فیہ علۃ توجب ضعفہ۔ معلوم ہو گیا کہ یا تو ابن صلاح کا یہ موقف ہی نہیں

کہ "متاخرین تصحیح وتضعیف کے حقدار نہیں" جیساکہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اور اگر یہی موقف ہے تو پھر ان کے اپنے قول سے متعارض ہونے کی وجہ سے مرجوح ہے۔ جب ابن صلاح کے نزدیک کسی حدیث میں علۃ موجبہ للضعف کے ظاہر ہونے کے بعد اس حدیث پر متاخرین کو ضعف کا حکم لگانے کا حق ہے تو لامحالہ تصحیح کا حق بھی ہوگا۔ چنانچہ حافظ زین العراقی اپنی کتاب نعقت میں فرماتے ہیں۔ "...... انہ یتتبع ویحکم علیہ بمایلیق بحالہ من الحسن اوالصحۃ اوالضعف" کہ حاکم کی احادیث کا تتبع کیا جائے گا، اور حسن، صحۃ اور ضعف میں سے جسکی حدیث لائق ہوگی وہی حکم لگایا جائے گا (نہ کہ فقط ضعف کا کما قال ابن صلاح) ابن صلاح چونکہ اس زمانہ میں "تصحیح" کے قائل نہیں اس لئے فقط الاان تظہر فیہ علۃ توجب ضعفہ کہا اور دبی زبان میں متاخرین کیلئے تصحیح وتضعیف کے حق کے قائل ہو گئے۔

اسی طرح شیخ ایک اور مقام پر بھی اپنے اس موقف پر پابند نظر نہیں آتے، اس طرح کہ کتب حدیث پر جو مستخرجات لکھی گئی ہیں ان میں درج شدہ احادیث کے بارے میں ابن صلاح کا مذہب یہ ہے کہ وہ صحیح ہیں حالانکہ نہ وہ کتب صحاح میں ہیں اور نہ ان کی تصحیح پر متقدمین کی تصریح موجود ہے، لہٰذا اگر مستخرجات کی احادیث پر صحت کا حکم متاخرین لگا سکتے ہیں تو دوسری احادیث پر بھی تصحیح وتضعیف کا حکم لگانیکا انکو حق ہونا چاہیے۔ چنانچہ علامہ طاہر جزائری اپنی کتاب "توجیہ النظر" میں فرماتے ہیں:

ذھب ابن الصلاح الی ان الزیادات الواقعۃ فی المستخرجات یحکم بہا بالصحۃ لانہا مرویۃ بالاسانید الثابتۃ فی الصحیحین اواحدھما الخ۔ (توجیہ النظر صفحہ ۱۴۳)	مستخرجات میں واقع شدہ زیادات کے بارے میں ابن صلاح کا مذہب یہ ہے کہ ان پر صحت کا حکم لگایا جائیگا۔ اس لئے کہ ان تمام زیادات کو اسانید ثابتۃ (صحیحہ) سے بخاری ومسلم یا کسی ایک میں روایت کیا گیا ہے۔

اس پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

فقد وقع ابن الصلاح ھنا فیما فرمنہ وھو عدم التصحیح فی ھذا الزمان لانہ اطلق تصحیح ھذہ الزیادات ثم عللہا بتعلیل اخص من دعواہ۔ (توجیہ النظر صفحہ ۱۴۲)	یہاں ابن صلاح وہی بات کہہ گئے ہیں کہ جس سے بھاگے تھے۔ یعنی یہ کہ اس زمانہ میں تصحیح حدیث کا حق کسی کو نہیں ہے۔ اس لئے کہ ادھر تصحیح تو تمام زیادات کی کر رہے ہیں۔ (خواہ وہ بخاری ومسلم او احدہما پر مستخرجات میں ہوں یا کسی

دوسری کتاب میں ترجیح ہیں) اور ادھر اسکی علت (صحیحین او احدہما) کے ساتھ مقید کر کے) اپنے دعوی سے اخص بیان کر رہے ہیں۔

حاصل یہ کہ ادھر تو شیخ متاخرین کو تصحیح و تضعیف کا حق دینے کیلئے تیار نہیں اور ادھر خود صحت کا حکم لگا رہے ہیں۔ اور اسکی اجازت دے رہے ہیں۔

عاشراً ابن صلاح کا موقف اس لئے بھی قابل ترجیح نہیں کہ حافظ ابوبکر حازمی المتوفی ۵۸۴ھ نے اپنی کتاب "الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار" میں ترجیح احد الحدیثین علی الآخر کی پچاس۵۰ وجوہ ذکر کی ہیں۔ لیکن ان میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ "اگر ایک حدیث صحیحین میں یا دوسری کتب صحاح میں ہو تو وہ راجح ہے کیونکہ وہ کتب صحاح میں ہے" بلکہ وجہ ترجیح رجال سند اور رواۃ حدیث کو ہی کہا ہے۔ جب ترجیح احد الحدیثین علی الآخر کا مدار رجال اور اصول نقد پہ ہے تو لامحالہ متاخرین کو تصحیح و تضعیف کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ اس کے قواعد و ضوابط سے کما حقہٗ واقفیت حاصل ہو۔ تلك عشرة كاملة۔

شیخ ابن صلاح اور تعداد احادیث صحاح | شیخ ابن صلاح نے اپنے موقف کی تائید میں حافظ عبداللہ بن اخرم کی تابعداری کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ:

قل ما يفوت البخاري ومسلما مما يثبت من الحديث يعني في كتابيهما. (مقدمہ صفحہ ۱۶)	امام بخاری و مسلم سے اپنی اپنی کتاب میں احادیث (صحیحہ) بہت ہی کم رہ گئی ہیں۔ (اکثر صحاح احادیث بخاری و مسلم میں آگئی ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جب اکثر و بیشتر احادیث صحیحہ بخاری و مسلم میں آگئی ہیں اور بہت ہی کم صحیح احادیث ان سے چھوٹی ہیں تو اب خواہ مخواہ کیا ضرورت پڑی ہے، کہ متاخرین کسی حدیث پر صحت یا ضعف کا حکم لگاتے رہیں، بلکہ متقدمین کی تصحیح و تضعیف پر یا کتب خمسہ پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

شیخ ابن صلاح اور شیخ عبداللہ بن اخرم کا یہ قول بھی قابل قبول نہیں۔ اور اس کے جواب میں امام نووی نے جو یہ کہا ہے کہ "صرف صحیحین کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان سے احادیث صحیحہ بہت کم رہ گئی ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ کتب خمسہ سے بہت کم احادیث صحیحہ رہ گئی ہیں"۔

"والصواب انه لم يفت الاصول الخمسة الا اليسير اعني الصحيحين وسنن ابي داؤد والترمذي والنسائي۔" تقریب مع التدریب صفحہ ۵۴	صحیح یہ ہے کہ اصول خمسہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی سے احادیث صحیحہ بہت کم رہی ہیں۔ (ان سب میں اکثر صحاح احادیث آگئی ہیں نہ کہ فقط بخاری و مسلم میں)

اس میں بھی نظر ہے۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ کتب خمسہ سے بھی بہت زیادہ احادیث صحیحہ رہ گئی ہیں۔ اس لئے کہ ہم جب کتب خمسہ کی احادیث کا استقصار کرتے ہیں تو ہم کو درج ذیل اعداد وشمار حاصل ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری	بحذف المکررات	۲۶۰۲	(علیٰ قول الراجح)
مسلم	" "	۴۰۰۰	
سنن ابی داؤد	کل	۴۸۰۰	
ترمذی	بحذف المکررات	۳۷۲۹	
نسائی	کل	۴۴۸۲	
	مجموعہ	۱۹۶۱۳	

اور اگر اس مجموعے کے ساتھ ابن ماجہ کی بھی ۴۳۳۸ احادیث ملا لی جائیں تو کل احادیث کی تعداد ۲۳۹۵۱ ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کی سب احادیث صحیحہ نہیں ہیں، بلکہ بخاری ومسلم کے علاوہ دیگر کتب میں ضعیف اور منکر احادیث بھی ہیں۔ بفرضِ محال سب کو صحیح تسلیم کرلیا جائے اور پھر اس عدد کا مقابلہ امام بخاریؒ کے اس قول سے کیا جائے کہ:

احفظ مائۃ الف حدیث صحیح و مائتی الف حدیث غیر صحیح۔ — کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں۔

تدریب ص۲۵ و مقدمہ ص۱۶

تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ کتب خمسہ بلکہ ستہ میں جو احادیث صحیحہ آسکتی ہیں ان سے زیادہ رہ گئی ہیں۔ اس لئے کہ:

امام بخاریؒ کو صحیح احادیث جو یاد تھیں وہ	۱۰۰۰۰۰	ہیں اور
کتب ستہ میں جو آسکی ہیں (غیر صحیح وصحیح) وہ	۲۳۹۵۱	ہیں۔ تو
امام بخاری کی بقیہ احادیث	۷۶۰۴۹	رہ جاتی ہیں۔

اور یہ کتب ستہ کی احادیث ۲۳۹۵۱ سے زیادہ ہیں۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ امام بخاری کا یہ قول کہ احفظ مائۃ الف حدیث الخ بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ تتبع اور تلاش کے بعد بھی صحاح احادیث کی اتنی تعداد نہیں بنتی۔ پھر انہوں نے امام بخاری کے قول کی توجیہات کرنا شروع کردی ہیں ـــ راقم الحروف کہتا ہے

کہ ایک لاکھ نہ سہی، پچاس ہزار سہی، تب بھی کتب ستہ کی احادیث سے بخاری کو جو یاد تھیں وہ زیادہ ہیں۔ کیونکہ :

بخاری کو جو یاد تھیں (کم از کم بحذف المکررات بالفرض) وہ	۵۰۰۰۰	ہیں اور
کتب خمسہ کی کل احادیث صحیح وغیر صحیح	۲۳۹۵۱	ہیں تو
بقیہ جو بچیں وہ	۲۶۰۴۸	ہیں۔ یہ تعداد

پھر کتب ستہ کی احادیث سے زیادہ ہے تو ابن صلاح کا یہ قول کہ "بخاری ومسلم سے بہت کم صحیح احادیث رہ گئی ہیں۔ اور امام نووی کا یہ قول کہ کتب خمسہ سے بہت کم احادیث رہی ہیں۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے بڑھ کر اگر کتب خمسہ کی احادیث کا مقابلہ امام احمدؒ کے قول "صح سبعمائة الف وکسر" تدریب ص۲۶ سے کیا جائے تو پھر جو صحاح احادیث کتب خمسہ میں آئی ہیں وہ ان صحیح حدیثوں کا پینتیسواں ۳۵ حصہ بھی نہیں ہیں، جو امام احمد کے پاس تھیں۔ لہذا ابن صلاح و امام نووی کے اقوال میں نظر ہے۔ ابن صلاح کے قول کی تردید تو خود امام بخاری کا یہ قول کرتا ہے کہ

ماکتبت فی کتابی ھذا الا الصحیح	(یہ تو ٹھیک ہے کہ) میں نے اپنی کتاب میں
من الاحادیث والتی ترکتھا اکثر	وہی احادیث درج کی ہیں جو صحیح تھیں (لیکن یہ
مصابح ص۱۳ تدریب ص۲۶ وغیرھا	نہیں ہے کہ میں نے سب صحاح کو جمع کر دیا
	ہے بلکہ) جو میں نے صحیح احادیث چھوڑ دی ہیں وہ (ان احادیث سے) بہت زیادہ ہیں۔ (جو میں نے درج کی ہیں۔)

اسی طرح امام مسلم کا یہ قول بھی ابن صلاح کے دعوٰی کی تردید کرتا ہے کہ :

لیس کل صحیح کتبتہ ھھنا ولکن کتبت	میں نے تمام صحاح کو مسلم میں جمع نہیں کیا
الاحادیث التی اجمع العلماء علی صحتھا۔	بلکہ صرف انہی کو جمع کیا ہے جنکی صحت پہ
مصابح ص۱۳ وتدریب ص۲۶ ۔	علماء وقت نے اتفاق کیا۔

لہذا یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ صحیحین سے بہت کم صحاح احادیث چھوٹی ہیں۔ بلکہ کم آسکی ہیں۔ اور زیادہ رہ گئی ہیں۔ اور اب وہ احادیث جو رہ گئی ہیں۔ بخاری ومسلم یا دیگر کتب صحاح سے انکی تضعیف یا تصحیح کے لئے بھی تو کوئی معیار ہونا چاہیئے، اور وہ رجال سند اور اصول نقد ہیں اور جب معیار تصحیح وتضعیف رجال سند اور اصول نقد ہیں تو جس طرح متقدمین نے احادیث کی تصحیح وتضعیف کی ہے اسیطرح متاخرین کو بھی اصول وقواعد کی روشنی میں اسکا اختیار ہوگا۔

(باقی ص۴۸ پر)

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع وناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا